طلوعِ اسلام

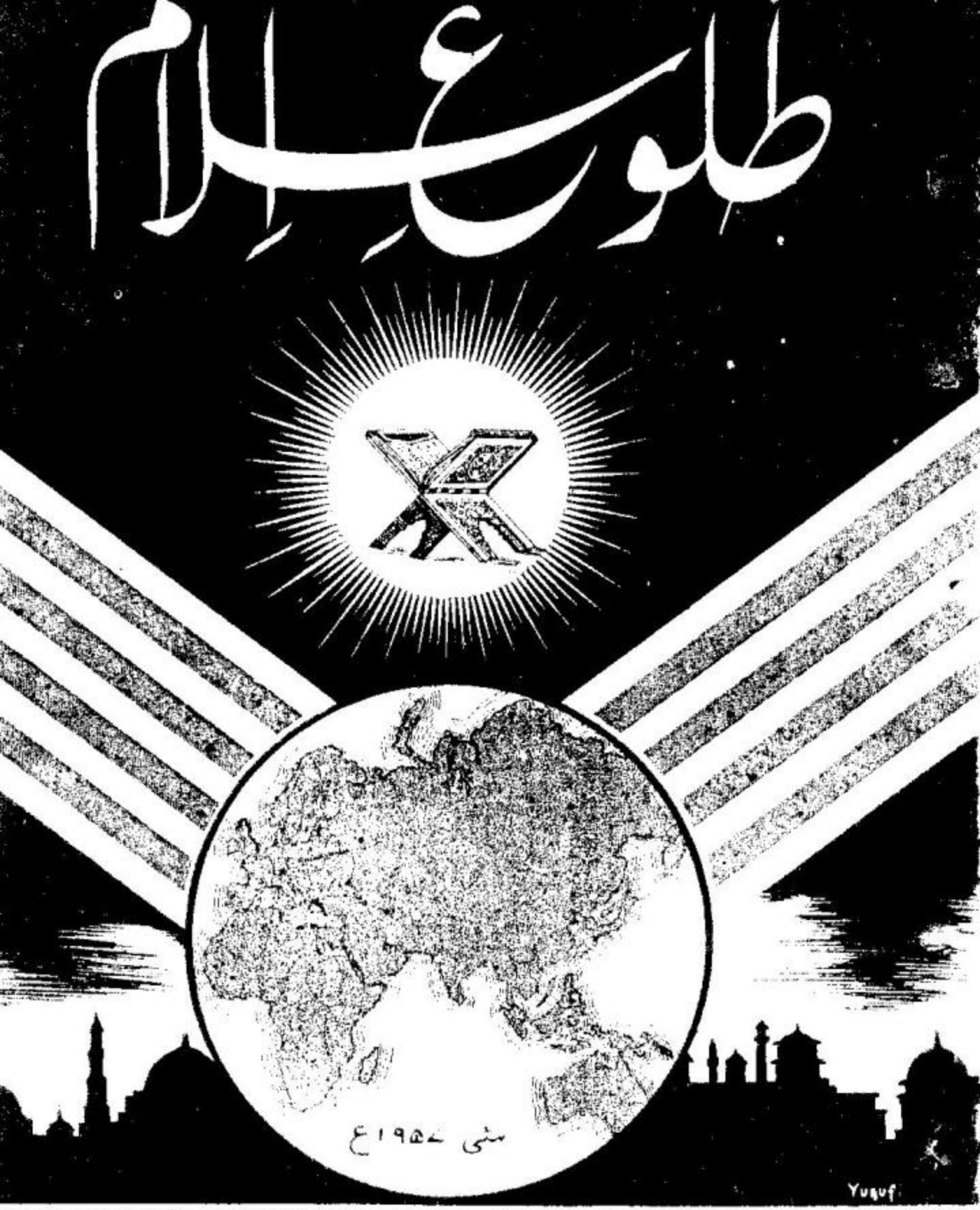

ادارہ طلوعِ اسلام لاہور

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ماہنامہ — کراچی

بدل اشتراک
ہندوستان اور پاکستان سے سالانہ آٹھ روپے
غیر ممالک سے سالانہ ۱۴ شلنگ

قیمت فی پرچہ
ہندوستان اور پاکستان سے
بارہ آنے

ٹیلیفون نمبر:- ۴۱۴۸۸
خط و کتابت کا پتہ:- ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام
۱۵۹/۳ ۔ ایل ۔ پی ۔ ای ۔ سی ۔ ایچ سوسائٹی ، کراچی ۲۹

جلد ۱۰	مئی ۱۹۵۶ء	نمبر ۵

فہرست مضامین

ایک اور شمع بجھ گئی		۲
لمعات		۳ ـــ ۸
جشنِ نزولِ قرآن	(محترم پرویز صاحب)	۹ ـــ ۲۴
روحانیت		۲۵ ـــ ۳۲
مجلس اقبال		۳۳ ـــ ۴۰
اسلام کی سرگذشت		۴۱ ـــ ۴۸
حقائق و عبر		۵۱ ـــ ۶۱
نقد و نظر		۶۲ ـــ ۶۶
القرآن الکتاب	(محترمہ زینب خاتون صاحبہ)	۶۷ ـــ ۷۰
چند قابلِ غور حدیثیں	(محترم لیق احمد شاہ صاحب چرتھاولی)	۷۱ ـــ ۷۳
بقیہ لمعات		۷۵ ـــ ۷۶
رابطۂ باہمی	(سکریٹری مرکزی بزم طلوعِ اسلام)	۷۷ ـــ ۷۸

ایک اور شمع بُجھ گئی

مردان سے ڈاکٹر انور علی خان کا حسب ذیل خط موصول ہوا ہے:-

محترمی پرویز صاحب۔ السلام علیکم۔ آپ کو یہ اطلاع دیتے ہوئے دل کانپتا ہے کہ مولانا عرب صاحب مورخہ ۱۳ اپریل ۵۷ء کو بروز ہفتہ رحلت فرما گئے (انا للہ وانا الیہ راجعون) پچھلے سال ۲۳ مارچ کو آپ پر فالج کا حملہ ہوا تھا۔ ڈاکٹر محمد اکرام خان آف مردان نے علاج کیا۔ جس سے آپ صحتیاب ہو گئے تھے۔ لیکن ایک سال گذرنے کے بعد ۱۲ اپریل کو اسی مرض کا دوبارہ حملہ ہوا اور موت کے ناترس ہاتھ نے مولانا صاحب کو ہم سے چھین لیا۔ مولانا مرحوم کا اصلی نام نور احمد تھا۔ والد کا نام عبدالبصیر بن شاہ ولی بن استارا خان تھا۔ آپ نعمان قوم کے خدو خیل قبیلہ سے تھے جو باجا بام خیل کا مشہور قبیلہ ہے۔ آپ بچپن میں اپنے والد بزرگوار کے ساتھ فریضہ حج ادا کرنے گئے۔ ان کے والد صاحب مکہ مکرمہ میں فوت ہو گئے۔ اسکے بعد ایک عرب رئیس نے مولانا صاحب کی تربیت حرم نبوی میں کی۔ آپنے مدینہ منورہ میں اٹھارہ سال گذارے اور تمام علوم اسلامی میں مہارت حاصل کی۔ اسی وجہ سے آپ عربی زبان کے بہت بڑے ماہر اور "مولوی عرب" کے نام سے مشہور تھے۔ اسکے بعد آپ کانپور۔ بمبئی اور مدرسہ رامپور میں بطور مدرس رہے۔ ڈھائی سال تک مولانا اشرف علی صاحب تھانوی سے فیض حاصل کیا۔ رامپور میں مولانا محمد طیب صاحب مکی کے درس میں بھی رہے۔ ایک دن ہدایہ میں یہ مسئلہ نظر سے گذرا کہ اگر کوئی شخص کسی کی آنکھ نکالے تو اسکی آنکھ نہیں نکالی جائیگی۔ ممکن ہے دونوں آنکھوں کی جسامت مساوی نہ ہو یا بصارت میں فرق ہو۔ اس وجہ سے لوہا گرم کر کے مجرم کی آنکھ کے سامنے رکھا جائے یہاں تک اسکی بینائی ختم ہو جائے۔ مولانا نے یہ مسئلہ مولانا محمد طیب صاحب کے سامنے پیش کیا انھوں نے فرمایا کہ ان مسائل میں کثر غلطیاں ہیں۔ مولانا عرب صاحب پر اس بات کا گہرا اثر ہوا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ آپ قرآن کی طرف متوجہ ہوئے اور باقیماندہ زندگی اسی کتاب مقدس کے مطالعہ اور تبلیغ کے لیے وقف کر دی۔ آپ قرآن کریم کے بہت بڑے اور بے مثل عالم تھے۔ آپکے پسماندگان میں سے ایک بیوہ۔ دو لڑکے اور ایک لڑکی ہے۔ بڑا لڑکا عبداللہ سیکنڈ ایئر میں اور چھوٹا پرائمری میں تعلیم حاصل کرتا ہے۔ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِیْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِیْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِیْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَا اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ۔

مولانا عرب کو قرآن سے والہانہ عشق تھا۔ وہ قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کیلئے عمر بھر جان ہتھیلی پر رکھ کر مصروف جہاد رہے اور آخر وقت تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ کس قدر قابلِ رشک ہے ایسی زندگی اور کتنی حسین ہے ایسی موت۔ اُولٰٓئِكَ یُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوْا وَیُلَقَّوْنَ فِیْهَا تَحِیَّةً وَّسَلٰمًا۔ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا حَسُنَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا۔

اگرچہ مرحوم کی وفات پوری ملت کا نقصان ہے لیکن سرحد (بالخصوص مردان) کے قرآنی احباب کیلئے یہ صدمہ ناقابلِ تلافی ہے۔ میں ان کے غم میں برابر کا شریک ہوں۔ افسوس اس بات کا ہے کہ یہ حضرات جو کرسیاں چھوڑ جاتے ہیں وہ خالی کی خالی رہ جاتی ہیں۔ یہ ہماری انتہائی بدقسمتی ہے۔

جگر فگار — پرویز

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

اگر کوئی شخص پاکستان کی سیاسی تاریخ کو ایک فقرہ میں سمجھنا چاہے تو کہا جا سکتا ہے کہ ہمارے سیاسی راہ نماؤں نے پہلے نو سال آئین پاکستان کی چادر بُننے میں صرف کیے اور دسویں سال سے اُسے ادھیڑنے میں لگ گئے۔ کَالَّتِیْ نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ اَنْكَاثًا (۱۶/۹۲) اُس بڑھیا کی طرح جو دن بھر محنت اور مشقت سے سوت کاتتی رہی اور شام کے وقت اُسے خود اپنے ہاتھوں سے ادھیڑ کر رکھ دیا اَلَّذِیْنَ ضَلَّ سَعْیُهُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَهُمْ یَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ یُحْسِنُوْنَ صُنْعًا (۱۸/۱۰۴) یہ وہ لوگ ہیں جن کی تمام متاع حیات اور اس کے لئے جدوجہد رائگاں جاتی ہے لیکن وہ بزعم خویش سمجھتے یہ ہیں کہ وہ کوئی بڑا افلاطونی کارنامہ سرانجام دے رہے ہیں۔ نو سال کی خرابیٔ بسیار کے بعد جو دستور مرتب ہوا تھا۔ اسکی بیشتر دفعات ایسی ہیں جن پر ابھی عملدرآمد بھی شروع نہیں ہوا۔ لیکن وہی لوگ جنھوں نے اس دستور کی ترتیب و تدوین پر فتح و کامرانی کے شادیانے بجائے تھے، اور قوم سے کہا تھا کہ تمہیں اور تمہاری آنے والی نسلوں کو ہمارا زیر بار احسان رہنا چاہیئے کہ ہم نے تمہیں اس قسم کا دستور مرتب کر کے دیدیا، اب اس تگ و تاز میں مصروف ہیں کہ جو کچھ بنایا تھا اسے کس طرح بگاڑا اور جو کچھ بسایا تھا اُسے کس طرح اجاڑا جائے۔ پاکستان کے دو صوبے (بازو) ہیں اور ایک مرکز۔ ان دو صوبوں میں سے ایک (مغربی پاکستان) نے بڑی دوڑ دھوپ کے بعد، اپنے پانچ چھ ٹکڑوں کو جوڑ کر ایک وحدت (Unit) میں تبدیل کیا تھا اور اس پر ساری قوم نے چراغاں کیا تھا اور ایسا کرنا بھی چاہیئے تھا کہ ہم میں تشتت و افتراق کی بجائے اتحاد و اتفاق پیدا ہو گیا اور سینہ چاکانِ چمن ایک مدت کے بعد، ایک دوسرے سے گلے مل گئے۔ یہ اقدام بڑا مبارک اور یہ ساعت بڑی نیک تھی۔ اتحاد اور اتفاق کی طرف جو قدم بھی اٹھے درخورِ صد تبریک اور سزاوارِ ہزار تہنیت ہوتا ہے۔ لیکن ابھی اُس تجربہ کو پوری طرح آزمایا بھی نہیں گیا کہ اُس اتحاد کو پھر سے مبدل بہ افتراق کرنے کے منصوبے بندھنے شروع ہو گئے ہیں اور حیرت بالائے حیرت کہ اس قسم کی تحریک (بلکہ سازش) ان لوگوں کی طرف سے نہیں ہو رہی جو شروع سے اس وحدت کے خلاف تھے۔ اس کے علمبردار خیر سے، وہی حضرات ہیں جنھوں نے مخالفتوں کے علی الرغم اس تجویز کو پاس کیا تھا۔ آسمان کی آنکھ نے اس سے زیادہ عبرت انگیز اور تاسف خیز منظر شاید ہی کبھی دیکھا ہو! اور سب اس لئے ہو رہا ہے کہ ملک (مغربی پاکستان) کے مختلف حصوں میں بٹنے سے ایک وزیر اعظم کی جگہ پانچ چھ وزیر اعظم ہوں گے۔ دس بارہ وزراء کی جگہ چالیس پچاس وزارتیں ہوں گی۔ ایک اسمبلی کے بجائے پانچ چھ اسمبلیاں ہوں گی۔ اور اسی

نسبت سے کرسیوں، منصبوں اور اسامیوں میں اضافہ ہوگا۔ اس کے ساتھ ہی سندھی۔ پنجابی۔ سرحدی۔ بلوچی وغیرہ کی زمانۂ قبل از اسلام کی عصبیت جاہلیہ کی تسکین بھی ہو جائے گی۔ یعنی ان کے پیش نظر اپنے اپنے مفاد کا حصول اور اپنے اپنے جذبات کی تسکین ہے۔ ملک اور ملت کی بہبود سے کوئی واسطہ نہیں۔ مُردہ بہشت میں جائے یا دوزخ میں۔ ان کی بلا سے۔ انھیں اپنے حلوے مانڈے سے کام ہے۔

دوسری طرف مشرقی پاکستان ہے جو اشربوا فی قلوبھم العجل کی تاسف انگیز تفسیر ہے۔ ان کے دل میں گوسالہ کی محبت اتنی گہرائیوں تک پہنچ چکی ہے کہ وہ خدائے موسیٰ پر ایمان لانے ہی نہیں دیتی۔ ان کی ہر تجویز الفراق کی داعی اور ہر تحریک الوداع کی نقیب ہے۔ وہ قدم قدم پر "موسیٰ" کا دامن پکڑ کر بیٹھ جاتے اور شکوہ و شکایات کے زہر آلود نشتر کے چبھوکوں کے ساتھ کہتے ہیں کہ

کیا مصر میں قبروں کی جگہ نہ تھی کہ تو ہمیں مرنے کے لئے بیابان میں لے آیا۔ تو نے ہم سے
یہ کیا معاملہ کیا کہ ہمیں مصر سے نکال لایا؟ کیا یہ وہی بات نہیں جو ہم نے مصر میں تجھ سے
کہی تھی کہ ہم سے ہاتھ اٹھا تاکہ ہم مصریوں کی خدمت کریں کہ ہمارے لئے مصریوں کی خدمت
کرنا بیابان میں مرنے سے بہتر تھا۔ (توراۃ۔ کتاب خروج $\frac{۱۴}{۱۰-۱۲}$)

وہاں کے جسدِ سیاست میں ایک مستقل ناسور ہے جو سارے جسم کو زہر آلود کئے جا رہا ہے بلکہ کر چکا ہے۔ یہ ناسور ہے وہاں کا ہندو جو تعداد کے لحاظ سے تو اقلیت میں ہے لیکن مؤثر ہونے کے اعتبار سے اکثریت پر بھی بھاری ہے۔ وہاں کی سیاست کی نکیل اسی طبقہ کے ہاتھ میں ہے۔ ان کی کوشش یہ ہے کہ وہاں کے مسلمانوں کو مغربی پاکستان کے مسلمانوں سے الگ رکھا جائے۔ اور اس کشیدگی کو اس حد تک کھینچا جائے کہ بالآخر یہ رشتہ ٹوٹ کر رہ جائے۔

نو سال کی تگ و تاز کے بعد جو آئینِ پاکستان مرتب ہوا تھا اور جس کے مرتب کرنے میں مشرقی پاکستان کے نمائندگان برابر کے شریک تھے۔ اس کی رُو سے پوزیشن یہ ہے کہ فہرستِ اختیارات میں چورانوے (۹۴) شقیں ایسی ہیں جو کاملۃً صوبوں کی تفویض میں دیدی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ انیس (۱۹) شقیں مرکز اور صوبوں میں مشترک ہیں۔ اس کے مقابلہ میں مرکزی فہرست میں صرف تیس (۳۰) شقیں ہیں۔ یعنی دستوری حیثیت سے صوبوں کے اختیارات کچھ کم نہیں۔ بایں ہمہ اگر کسی صوبے کے باشندے یہ چاہیں کہ انھیں مزید اختیارات ملنے چاہئیں تو اسکے لئے دستور میں گنجائش موجود ہے۔ اس مقصد کے لئے طریق کار یہ ہے کہ مرکزی مجلس قانون ساز میں یہ تجویز پیش کی جائے کہ آئین میں فلاں فلاں ترمیم کی جائے۔ لیکن مشرقی پاکستان کے سیاسی راہ نما اس صاف اور سیدھے آئینی طریق کو اختیار کرنے کے بجائے یہ مطالبہ پیش کر رہے ہیں کہ انھیں کامل خود مختاری ملنی چاہیئے۔ کامل خود مختاری سے ان کا مفہوم کیا ہے اسے واضح نہیں کیا جاتا۔ لیکن اس سے فضا میں جو اثر پیدا ہو سکتا ہے (اور یہ اثر پیدا ہو چکا ہے) وہ ظاہر ہے۔ اس سے ہر شخص کے دل میں یہ خیال ابھر آیا ہے کہ مشرقی پاکستان آہستہ آہستہ مرکز سے علیحدگی اختیار کرنا چاہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ چیز وہاں کے ہندو (اور کمیونسٹ) کی منشاء کے عین مطابق ہے۔ اور وہ اپنے (اور بھارت کے) مفاد اور مصالح کی خاطر یہ سب کچھ کر رہا ہے۔ اور ہمارے مسلمان بھائی، دانستہ یا نادانستہ اس کے ہاتھ میں کھیل رہے ہیں اور نہیں سوچتے کہ جس شاخ

پر بیٹھے ہیں اسی کو کاٹنے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟

باقی رہا مرکز، سو اس کی حالت صوبوں سے بھی بدتر ہے۔ یہاں سے بھی آئے دن آئین میں اہم تبدیلیوں کی آوازیں اٹھتی رہتی ہیں۔ آئینِ پاکستان کے متعلق جو ہماری رائے ہے اس سے قارئین آگاہ ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ آئین بڑا ناقص ہے اس لئے اس میں اہم تبدیلیوں کی ضرورت ہے۔ لیکن یہ تبدیلیاں بھی آئین کے مطابق ہونی چاہئیں۔ دستور کی رو سے، مرکز کے صدرِ مملکت، وزیرِ اعظم اور دیگر وزراء نے اس امر کا حلف لے رکھا ہے کہ وہ "آئین کی نگہداشت، حفاظت اور پاسبانی کریں گے"۔ ظاہر ہے کہ آئین سے مراد وہی آئین ہے جسے مملکت کی مجلسِ آئین یا قانون ساز پاس کرے۔ بالفاظ دیگر صدرِ مملکت، وزیرِ اعظم یا دیگر وزراء مملکت کا فریضہ اس آئین کی پاسبانی اور حفاظت ہے جسے مجلسِ قانون ساز آئین قرار دیدے۔ اگر ان میں سے کوئی صاحب، منظور شدہ آئین کے کسی حصہ سے مطمئن نہ ہوں تو ان کے لئے صحیح راہِ عمل یہ ہے کہ وہ اپنے منصب سے استعفےٰ دے کر مجلسِ قانون ساز میں ایک ممبر کی حیثیت سے آجائیں اور وہاں آئین کے مطابق آئین میں تبدیلی کے لئے چارہ جوئی کریں۔ آئین کی مدافعت اور پاسبانی کا حلف لے کر اسی آئین کو ہدفِ مطاعن بنانا، کشتی کا ناخدا بن کر کشتی میں چھید ڈالنے کے مرادف ہے۔

مملکت سے نیچے اتر کر حکومت کی طرف آیئے تو وہاں اور ہی تماشا دکھائی دے گا۔ آپ (صوبائی یا مرکزی حکومت کے) کسی منسٹر کے کسی ایک ماہ کے پروگرام کا تجزیہ کیجئے اور پھر دیکھئے کہ وہ اپنے فرائض کی سرانجام دہی کے لئے کتنا وقت صرف کرتا ہے اور اپنی کرسی کے محفوظ رکھنے کی دوڑ دھوپ کے لئے کتنا! آپ دیکھیں گے کہ اسے اپنے فرائض پر توجہ دینے کے لئے دن بھر میں بمشکل چند لمحات ملیں گے۔ باقی سارا وقت اسی ادھیڑبن میں صرف ہو جائے گا کہ ان کی پارٹی کی منسٹری کس طرح قائم رہے۔ اور اس میں ان کی اپنی پوزیشن کیسے مستحکم ہو! جب صورت حال یہ ہو تو پھر ملک کے نظم و نسق کی جو حالت ہو سکتی ہے وہ ظاہر ہے۔ جہاں تک افراد کا تعلق ہے، ان میں اکثر ایسے ہیں جن کے کام کرنے کی استعداد (Capacity) میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا اگر انھیں اپنی پوزیشن کی صیانت کی طرف سے اطمینان ہو جائے اور پارٹیوں کی بساطِ سیاست پر مہرہ بازیوں کی ضرورت باقی نہ رہے اور اس طرح وہ اپنا پورا وقت اور توانائی مسائلِ مملکت کے لئے وقف کر سکیں (اور انھیں دین کی صحیح راہ نمائی مل جائے) تو اس کے نتائج کس قدر دور رس ہو سکتے ہیں۔ بحالاتِ موجودہ، آئینِ پاکستان میں مناسب ترمیم سے ایسی صورت پیدا کی جا سکتی ہے جس سے وزارتوں کو اس قسم کا اطمینان میسر آجائے۔ لیکن وہ بالکل بے مہار بھی نہ ہونے پائیں کہ جو جی میں آئے کرتے رہیں۔ انھیں کوئی پوچھنے والا ہی نہ ہو۔ ہمارے نزدیک یہ وقت کی بڑی اہم ضرورت ہے جس کی طرف فوراً توجہ دینی چاہیئے۔ اگر ہم نے اس کا احساس اور بروقت مداوا نہ کیا تو خطرہ ہے کہ یہاں بھی ایسے ہی حالات پیدا نہ ہو جائیں جس قسم کے حالات انڈونیشیا میں نمودار ہو گئے ہیں۔ اس خطرہ کا امکان اور بھی قوی ہو جاتا ہے جب اس حقیقت کو سامنے رکھا جائے کہ انڈونیشیا کی مذہبی جماعت کی طرح یہاں بھی اس قسم کی جماعتیں موجود ہیں جو مذہب کے نقاب میں حصولِ اقتدار کے لئے ہر ممکن حربہ

اختیار کرنے پر تلی بیٹھی ہیں۔

اس کے بعد ہمارے سامنے یہ سوال آتا ہے کہ ملک میں عام طور پر جو حالات پیدا ہوئے ہیں (اور جن کے ایک گوشے کی طرف ہم نے شروع میں اشارہ کیا ہے) اس کے علاج کی کیا صورت ہے؟ یہ وہ سوال ہے جس کے متعلق ہم بارہا لکھ چکے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ہمیں متعدد بار لکھنا ہوگا۔

یہ حقیقت ہے کہ قوموں کی زندگی کا مدار ان کے "ایمان" پر ہوتا ہے جس قدر کسی قوم کا ایمان قوی ہوگا اُسی قدر وہ قوم مضبوط ہوگی۔ اور جس قسم کے نظریۂ زندگی پر ان کا ایمان ہوگا اسی قسم کی اس قوم کی حالت ہوگی۔ انگریز کا ایمان ہے کہ مملکت برطانیہ ایک بہترین تہذیب کی حامل اور شاندار روایات کی امین ہے۔ اسلئے اسے ہر خطرہ سے محفوظ رکھنا نہایت ضروری ہے ان کا یہ ایمان بڑا محکم ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ سخت سے سخت مصیبت کا بڑی استقامت اور خندہ پیشانی سے مقابلہ کرتے ہیں اور اس میں جان تک دینے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ ان میں شاید ہی کوئی فرد ایسا نکلے جو اپنی مملکت کے مفاد کے خلاف غداری کرے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ہم اہل پاکستان کا بھی اس قسم کا کوئی ایمان ہے۔ اور اگر ہے تو وہ کس قدر محکم ہے؟ کسی کو اچھا لگے یا بُرا۔ لیکن یہ واقعہ ہے جس کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ ہمارا کوئی "اجتماعی ایمان" نہیں۔ ہم میں سے ہر ایک کے پیش نظر ذاتی اور انفرادی مفاد ہے اور اسی مفاد کا حصول ہمارا "ایمان" ہے۔ لہٰذا بات صاف اور واضح ہے۔ جب تک ہم میں "اجتماعی ایمان" نہیں پیدا ہوتا ہم میں وہ کیریکٹر پیدا نہیں ہو سکتا جس پر قوموں کی زندگی اور استحکام کا مدار ہوتا ہے سوال یہ ہے کہ وہ "اجتماعی ایمان" کیا ہونا چاہیئے؟

اس کا جواب کچھ مشکل نہیں۔ ہم نے پاکستان کا مطالبہ اس بنا پر کیا تھا کہ مسلمان، دین کے اشتراک کی بنیاد پر ایک جداگانہ قومیت رکھتے ہیں۔ اور ایک الگ خطۂ زمین چاہتے ہیں جس میں وہ اپنے دین کو ایک عملی شکل دے سکیں۔ ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ تحریکِ پاکستان کے دوران میں اس دعوے پر ہمارا ایمان نہیں تھا۔ لیکن یہ کہے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ حصولِ پاکستان کے بعد بہ حیثیت مجموعی اس دعوے پر ہمارا ایمان نہیں رہا۔ اب ہمارے سامنے دو راستے بالکل واضح اور متمیز ہیں۔ ہمارے ارباب حل وعقد میں سے جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کے لئے (یا ان کی دانست میں قوم کے لئے) یہ دعوے اجتماعی ایمان کا مرکزی نقطہ نہیں بن سکتا، انہیں چاہیئے کہ کھلے کھلے الفاظ میں اس کا اعلان کر دیں اور یہ بتا دیں کہ ان کے نزدیک اور کون سا تصور اس اجتماعی ایمان کا مرکزی نقطہ بن سکتا ہے۔ اگرچہ یہ حضرات مشرقی پاکستان میں مخلوط انتخاب کا فیصلہ کر کے اور مغربی پاکستان میں اسکے لئے جدوجہد سے اپنے پیش نظر تصور کا بالواسطہ اظہار کر چکے ہیں۔ لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ یہ اس کا بلاواسطہ اعلان کر دیں اور اس تصور کو وہ آئندہ انتخابات میں اپنا منشور قرار دے کر ملک سے فیصلہ لے لیں۔

لیکن ہمیں یقین ہے کہ ملک کبھی اس تصور کے حق میں فیصلہ نہیں دے گا۔ اس لئے کہ ہمیں اپنے عوام پر پورا اعتماد ہے کہ

وہ تحریکِ پاکستان کے دوران میں بھی اسلامی مطالبہ کے بدل حامی تھے۔ اور اب بھی ایک صحیح اسلامی معاشرے کا قیام دل سے چاہتے ہیں۔ افسوس یہ ہے کہ ہم نے ان کی تعلیم اور تربیت کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ نہ ہی اس تصورِ پاکستان کے زندہ رکھنے اور عام کرنے کے لئے کوئی اقدام کیا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر اس تصور کو عام اور اس سے فضا کو اس طرح معمور کر دیا جائے کہ ہر شخص شعوری یا غیر شعوری طور پر اسے جذب کرتا چلا جائے، تو آج بھی اسلام کا رشتہ، مشرقی اور مغربی پاکستان میں ایک مستحکم وحدت اور یگانگت کا موجب، اور مغربی پاکستان میں سندھی اور پنجابی کے امتیاز کو مٹا کر ملی برادری کا محکم ذریعہ بن سکتا ہے۔ یہی وہ تصور ہے جو ہمارے اجتماعی ایمان کا مرکزی نقطہ ہے۔ اسی میں ہماری نجات و سعادت کا راز مضمر ہے۔ اسی سے پاکستان کا استحکام وابستہ ہے اور یہی ہمارے تمام دکھوں کا واحد علاج ہے۔ جن لوگوں نے پاکستان کو اسلئے حاصل کیا تھا کہ یہ اسلام کی تجربہ گاہ بن سکے ان کے لئے کرنے کا کام یہی ہے کہ اس تصور کو زیادہ سے زیادہ حد تک عام کیا جائے۔ حقیقت میں یہ کام حکومت کے کرنے کا تھا۔ لیکن حکومتیں آتی رہیں اور حکومتیں جاتی رہیں مگر اس کی طرف کسی نے بھی توجہ نہ دی۔ جنھیں (ملا کی زبان میں) ملحد اور بے دین کہا جاتا ہے، انھیں چھوڑ دیئے۔ جو اربابِ اقتدار دین کے حامی اور مذہب کے شیدائی کہے جاتے تھے، انھوں نے بھی اس باب میں کچھ نہ کیا۔ ان کی ساری قوتیں مذہبی جماعتوں کے ساتھ گٹھ جوڑ میں صرف ہو گئیں تاکہ وہ بوقتِ ضرورت ان کے کام آسکیں۔ ویسے دیکھئے تو اسلامی تعلیم و تمدن اور ادب و ثقافت کے نام پر حکومت کی طرف سے لاکھوں روپے سالانہ صرف ہو رہے ہیں۔ مثلاً ۱۹۵۷-۵۸ء کے مرکزی حکومت کے بجٹ میں دیکھئے تو آپ کو حکومت کی طرف سے اس قسم کی متعدد امدادی مدات نظر آئیں گی۔ مثلاً

(۱) پاکستان کلچرل ایسوسی ایشن	پندرہ ہزار روپیہ
(۲) اقبال اکاڈیمی	ایک لاکھ پچاس ہزار روپیہ
(۳) فلاسیکل کانگریس	دس ہزار روپیہ
(۴) ادارۂ ثقافت اسلامیہ (لاہور)	پچھتر ہزار روپیہ
(۵) ایشیاٹک سوسائٹی۔ ڈھاکہ	تیس ہزار روپیہ
(۶) پنجاب ہسٹاریکل سوسائٹی	چالیس ہزار روپیہ
(۷) ادارۂ تحقیقاتِ اسلامیہ	ساڑھے تین لاکھ روپیہ
(۸) پنجاب یونیورسٹی برائے تیاری انسائیکلوپیڈیا آف اسلام	پچیس ہزار روپیہ
(۹) آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس	پچیس ہزار روپیہ
(۱۰) انجمن حروف القرآن	پچاس ہزار روپیہ
(۱۱) سندھ ادبی بورڈ	ایک لاکھ پچیس ہزار روپیہ

(۱۲) پاکستان عریک کلچرل ایسوسی ایشن گیارہ ہزار روپیہ

ان میں بعض ادارے تو ایسے ہیں جن کا کسی نے شاید نام تک بھی نہ سنا ہوگا۔ لیکن جن اداروں سے لوگ واقف ہیں، ان میں مسلمانوں کے تمدن و ثقافت۔ اقبال کے پیغام و تصور اور اسلام کی ریسرچ اور ری کنسٹرکشن کے سلسلہ میں جو کچھ ہو رہا ہے، وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ بعض گوشوں میں سرے سے کچھ ہو ہی نہیں رہا اور جہاں کچھ ہو رہا ہے وہ ذہنی عیاشی سے زیادہ کچھ نہیں۔ اگر اس غریب قوم کا یہی روپیہ اس تصور کے عام کرنے میں صرف کیا جاتا جس کی بنا پر ہم نے پاکستان کو حاصل کیا تھا، تو آپ دیکھتے کہ اس کے نتائج کس قدر تعمیری ہوتے۔ بدنصیب افراد کی طرح بدقسمت اقوام کی بھی شومئی قسمت یہ نہیں ہوتی کہ ان کے ہاں پیسہ کی کمی ہوتی ہے۔ ان کی سوختہ بختی یہ ہوتی ہے کہ ان کا پیسہ صحیح مصرف میں خرچ نہیں ہوتا۔ "ادب و ثقافت" وغیرہ ایوان ملت کی تزئین و آرائش کا سامان ہیں۔ اس کی بنیاد، دین کا وہ تصور ہے جس کی وحدت اور اشتراک کی بنا پر ہم ایک ملتِ واحدہ اور امتِ وسطیٰ بنتے ہیں۔ اگر کسی مکان کی بنیاد نیچے سے کھسک رہی ہو اور اہلِ خانہ مکان کی پینٹنگ میں مصروف ہوں تو ان کی اس عقلمندی کی داد کون دے گا؟ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس روپے کو اس طرح ضائع ہونے سے بچایا جائے اور اسے اس تصور کے عام کرنے میں صرف کیا جائے جس پر پاکستان کی عمارت استوار ہے۔ اگر نیک نیتی سے اس کام کو ہاتھ میں لیا جائے تو بہت تھوڑے عرصہ میں یہاں ذہنی اور قلبی انقلاب پیدا ہو سکتا ہے۔

کیا ہم توقع کریں کہ ہمارے اربابِ حکومت اس طرف توجہ دیں گے؟

(۲)

علامہ اقبال کے فرزندِ اصغر، جاوید اقبال گذشتہ سرما میں حصولِ تعلیم کے بعد ولایت سے واپس آئے تھے۔ جی چاہتا تھا کہ معلوم کریں کہ وہ یورپ سے کس قسم کے خیالات لے کر لوٹے ہیں۔ کراچی میں (یومِ اقبال کی تقریب پر) انھیں دیکھنے کا موقع ملا۔

ایک عظیم شخصیت کے حامل باپ کا بیٹا، جس گھاٹے Disadvantageous position میں رہتا ہے وہ ظاہر ہے۔ اُسے ہر شخص، اس کی زندگی کے ابتدائی دور ہی میں، اُن پیمانوں سے ماپنے لگ جاتا ہے جو اسکے والد کی زندگی کے آخری دور میں متعین ہوئے تھے۔ حالانکہ یہ ظاہر ہے کہ اگر اس نے (بفرضِ محال) باپ کی پوری کی پوری صلاحیتوں کو بھی وراثت میں پالیا ہو تو بھی وہ صلاحیتیں، اس کی عمر کے ابتدائی دور میں، محض مضمر حالت (Potential Form) میں ہونگی جنھیں بارز (Actualised) ہونے کے لئے ایک عمر درکار ہوتی ہے۔ ایسے نوجوانوں کے متعلق دیکھنا صرف یہ چاہیئے کہ ان میں بنیادی طور پر باپ کے تصورات کا عکس موجود ہے یا نہیں۔ ہم نے (ڈاکٹر) جاوید اقبال کو اسی نقطۂ نگاہ سے دیکھا اور خوشی ہے کہ مطمئن لوٹے۔ ہمارے اس اطمینان اور اس سے پیدا شدہ مسرت کے لئے ان کا ایک فقرہ کافی تھا۔ انھوں نے ایک مختصر سا مقالہ پڑھا جس کا موضوع یہ تھا کہ علامہ اقبال نے اسلامی قوانینِ شریعت اور تصوراتِ حیات کے سلسلہ میں کس انداز کی وسیع النظری (Liberalism) کی تعلیم دی ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے آخر میں کہا کہ ہمیں (باقی صفحہ ۲۵ پر دیکھئے)

قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا

عید یعنی

جشنِ نزولِ قرآن

کا حسین ترین تحفہ

منجانب ادارۂ طلوعِ اسلام کراچی

اس میں اپنے دوستوں کو بھی شریک کیجئے

جشنِ نزولِ قرآن

[محترم پرویز صاحب، ہر اتوار کی صبح، اپنے مکان پر، قرآن کریم کا درس دیتے ہیں۔ ابتدائے رمضان میں روزوں کے احکام کے سلسلہ میں نزولِ قرآن کا ذکر آیا تو انھوں نے کہا کہ اس نسبت سے، دو ایک نشستوں میں قرآن کا تعارف خود قرآن سے کرا دیا جائے تو بہتر ہوگا۔ چنانچہ ۷ اور ۱۴ اپریل کے خطبات کا یہی موضوع رہا۔ موضوع کی اہمیت کے پیش نظر ان خطبات کو ٹیپ ریکارڈ میں محفوظ کرا لیا گیا۔ اب اس ریکارڈ سے ان خطبات کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کر کے، قارئین کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔ اس کا الگ پمفلٹ بھی شائع ہو رہا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ بہترین تحفہ (یا عید کارڈ) ہو سکتا ہے جسے عید مبارک کی تقریب سعید پر دوستوں کو بھیجا جائے۔

کراچی کے مقامی حضرات میں سے جنھیں اب تک پرویز صاحب کے درسِ قرآن میں شرکت کا اتفاق نہیں ہوا، وہ ان خطبات سے اندازہ لگا سکیں گے کہ وہ کس قدر زندگی بخش اور بصیرت افروز تعلیم کو (Miss) کر رہے ہیں۔ طلوع اسلام]

برادرانِ عزیز!

سابقہ نشست میں، روزوں سے متعلق احکام و مقاصد کے ضمن میں جب یہ سوال سامنے آیا کہ اس کے لئے رمضان کے مہینے کو کیوں مخصوص کیا گیا؟ تو اس کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ جواب ملا کہ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْ أُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْآنُ۔ (۲/۱۸۵) رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن نازل ہوا تھا۔ یعنی روزوں کے عظیم پروگرام کیلئے اس مہینہ کو اسلئے منتخب کیا گیا کہ اس میں نزولِ قرآن کا آغاز ہوا تھا اس نسبت سے میں سمجھتا ہوں کہ یہ مناسب و موزوں ہوگا کہ ہم اس مہینے میں آنیوالے درس کی ایک دو نشستوں میں یہ دیکھیں کہ قرآن کیا ہے اور کائنات میں اس کا مقام کیا؟ اس کی غرض و غایت کیا ہے اور منزل و مقصود کیا؟ اس کے ملنے سے انسانیت کو کیا ملا؟ اور یہ نہ ملتا تو انسانی زندگی کن سعادتوں سے محروم رہ جاتی۔ اسمیں شبہ نہیں کہ ہمارا ہر درس قرآن ہی کے قانون و حکمت پر مشتمل ہوتا ہے اور ہماری ہر نشست میں اسی کی تعلیم سامنے آتی ہے۔ لیکن شہر رمضان کی خصوصی نشستوں میں میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ خود خدا نے قرآن کا تعارف کس طرح سے کرایا ہے۔ اسلئے کہ مصنف سے بڑھ کر اپنی کتاب کا تعارف کوئی اور نہیں کرا سکتا۔ قرآن، خدا کی کتاب ہے۔ اور کتاب بھی ایسی جس کے متعلق بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ — تراشیدہ دستِ از قلم کشید خدا۔ یہی وہ آخری کتاب ہے جسکے مطابق عدالتِ خداوندی سے کائناتِ انفس و آفاق کے تمام معاملات کے فیصلے ہوتے اور جس کی رو سے قوموں کو انکی موت و حیات کے پروانے ملتے ہیں۔

قرآنی تعلیم کا نقطۂ ماسکہ

قرآنی تعلیم کا نقطۂ ماسکہ یہ ہے کہ کائنات میں ہر شے خدا کے متعین کردہ قانون کے مطابق سرگرم عمل ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ محیر العقول کارگہ ہستی جس کے تصور سے ذہن انسانی ورطۂ حیرت میں ڈوب کردہ جاتا ہے اس حسن و خوبی اور ربط و ضبط سے چل رہا ہے کہ اس میں نہ کہیں کوئی سقم ہے نہ خلل۔ نہ فساد ہے نہ انتشار نہ تزاحم ہے نہ تصادم۔ ہر شے اپنے اپنے فریضہ کی ادائیگی میں انتہائی جذب و انہماک سے سرگرداں ہے اور اس سعی و عمل کا مجموعی نتیجہ تعمیر و ارتقاء (Construction and Progress) کی شکل میں ہر آن سامنے آجاتا ہے۔ قرآن کا کہنا یہ ہے کہ اسی قسم کے غیر متبدل قوانین ـــ جنہیں عام طور پر مستقل اقدار (Permanent Values) کہا جاتا ہے ـــ انسانی زندگی کیلئے بھی مقرر ہیں۔ اگر انسانی معاشرہ ان قوانین کے مطابق چلے تو اس کا نتیجہ، خارجی کائنات کی طرح، ہمیشہ تعمیری اور ارتقائی ہوگا۔ اگر وہ اس کے خلاف چلے تو وہ تخریب اور فساد کے جہنم میں جا گریگا۔ چونکہ انسانی معاشرہ کے متعلق قوانین، مجرد اور غیر محسوس شکل (Abstract Form) میں ہیں، اور خارجی کائنات کا نظم و نسق انسان محسوس طور پر اپنے سامنے دیکھ سکتا ہے، اسلئے قرآن انسانی زندگی سے متعلق مجرد قوانین کو کائنات کے محسوس شواہد کی مثالوں سے سمجھاتا ہے۔ یہی طریق اللہ تعالےٰ نے خود قرآن کے تعارف کے لئے اختیار کیا ہے۔

ستاروں کی شہادت

مثلاً سورۂ واقعہ میں ہے فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوَاقِعِ النُّجُوْمِ۔ ان سے کہو کہ نہیں! بات یہ نہیں کہ میں ان نظری حقائق کو یونہی نظری طور پر بیان کر کے آگے بڑھ جاؤں گا۔ میں انہیں کائنات کے محسوس نظام کی مرئی مثالوں سے سمجھاؤں گا۔ اس ضمن میں میں سب سے پہلے ستاروں کی گذرگاہوں کو بطور شہادت پیش کرتا ہوں۔ وَاِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِیْمٌ۔ اور اگر تم علم و بصیرت کی بارگاہ سے دریافت کرو تو تمہیں معلوم ہو جائے کہ یہ شہادت کتنی عظیم شہادت ہے[1]۔

میں ستاروں کی گذرگاہوں ـــ ان کے طلوع و غروب کے مواقع ـــ کو اس حقیقت کبریٰ کی تثبیت کے لئے بطور شہادت پیش کرتا ہوں کہ

اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِیْمٌ (۵۶/۷۷-۷۵)

یہ قرآن بڑے شرف و مجد کا حامل اور نوع انسانی کے لئے بیحد نفع رساں اور عزت بخش ہے۔ خود واجب التکریم اور جو اسے راہ نما بنا لے اسے واجب التکریم بنا دینے کا ضامن اور کفیل۔

سورۂ تکویر میں اسی اجمال کو ذرا تفصیل سے بیان کیا گیا ہے جہاں فرمایا کہ فَلَآ اُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ۔ الْجَوَارِ الْكُنَّسِ۔ نہیں! میں شہادت میں پیش کرتا ہوں ان سیاروں کو جو پچھلے پاؤں لوٹ جاتے ہیں اور انہیں جو ایک برق یا غزالہ کی طرح تیزی سے آگے بڑھ کر چھپ جاتے ہیں۔ وَالَّیْلِ اِذَا عَسْعَسَ۔ وَالصُّبْحِ اِذَا تَنَفَّسَ۔ اور شہادت میں پیش کرتا ہوں رات کو جب وہ نہایت آہستہ دبے پاؤں آتی ہے

---

[1] ستاروں کی شہادت کے تفصیلی مفہوم کے لئے ادارہ طلوع اسلام کی طرف سے شائع کردہ پمفلٹ "مقام محمدی" یا مارچ ۱۹۵۷ء کا طلوع اسلام ملاحظہ کیجئے۔

اور اسی طرح خاموشی سے دبے پاؤں لوٹ جاتی ہے۔ اور صبح کو جب وہ اپنی مسیحا نفسی سے ساری دنیا کو حیاتِ نو کا پیام دینے کے لئے مشرق کے جھروکے سے نمودار ہوتی ہے۔

میں شہادت میں پیش کرتا ہوں ان تمام کائناتی شواہد کو اس حقیقت کبریٰ کی تبیین کے لئے کہ

اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ (۸۱/۱۹)

جس شخص کی زبان سے تم اس قرآن کو سن رہے ہو وہ ہمارا بھیجا ہوا قاصد ہے اور نہایت معزز اور واجب التکریم قاصد یعنی یہ پیغام (قرآن) بھی اَلْکَرِیْمُ (۵۶/۷۷) اور اس کا لانیوالا بھی اَلْکَرِیْمُ (۸۱/۱۹) اور جس (خدا) نے اسے بھیجا ہے وہ بھی اَلْکَرِیْمُ (۸۲/۶)

ارض و سما کی شہادت

سورہ الطارق میں ہے۔ وَالسَّمَاءِ ذَاتِ الرَّجْعِ۔ یہ فضائی کرے جو اس قدر عظیم الجثہ ہونے کے باوجود اس حسن و خوبی سے اپنے اپنے افلاک میں تیرتے پھرتے ہیں (۳۶/۴۰) اور اپنی گردش سے زندگی کے نئے نئے پہلو سامنے لاتے ہیں وہ اس حقیقت پر شاہد ہیں۔

اور یہ زمین جو بیج کو پھاڑ کر اس میں سے کونپل کی شکل میں ایک نئی زندگی کی نمود کرتی ہے (وَالْاَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ) یہ بھی اس حقیقت پر گواہ ہے کہ

اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ

قرآن ایک فیصلہ کن حقیقت ہے۔ اسمیں جو کچھ کہا گیا ہے وہ (Decisive) ہے۔ وَمَا هُوَ بِالْهَزْلِ (۸۶/۱۳-۱۴) یونہی مذاق نہیں۔ تم سمجھتے ہو کہ یہ محض شاعری ہے جسے زمانے کی گردشیں خود بخود مٹا دیں گی۔ [اَمْ يَقُوْلُوْنَ شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهٖ رَيْبَ الْمَنُوْنِ (۵۲/۳۰)] یہ غلط ہے فَلَآ اُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُوْنَ وَمَا لَا تُبْصِرُوْنَ۔ وہ تمام حقائق جو تمہاری آنکھوں کے سامنے آچکے ہیں جن کا احاطہ تمہاری بصیرت کر سکتی ہے اور وہ حقائق جو تمہاری نگاہوں سے مستور ہیں، وہ سب اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ

اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ۝ وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ (۶۹/۴۰-۴۱)

بصیرت کی شہادت

یہ (قرآن) ایک واجب التکریم پیغمبر کی وساطت سے پہنچنے والے ابدی حقائق کا مجموعہ ہے محض شاعرانہ تخیلات کا نگارخانہ فریب مرتعش نہیں وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ (۶۹/۴۲)۔ نہ ہی کسی انکل پچو باتیں بنانے والے نجومی کی قیاس آرائیاں ہیں بلکہ تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۶۹/۴۳) یہ اس خدا کی طرف سے نازل کردہ قوانین کا ضابطہ ہے جو تمام کائنات کا نشو و نما دینے والا ہے۔ ہر شے کو آہستہ آہستہ بتدریج اس کے نقطۂ آغاز سے معراجِ تکمیل تک پہنچانیوالا۔ اس قسم کے حقائق نہ کوئی شاعر دے سکتا ہے نہ مرگِ دیوانہ [وَيَقُوْلُوْنَ اَئِنَّا لَتَارِكُوْٓا اٰلِهَتِنَا لِشَاعِرٍ مَّجْنُوْنٍ (۳۷/۳۶)] بَلْ جَآءَ بِالْحَقِّ (۳۷/۳۷) یہ وہی دے سکتا ہے جو خدا کی طرف سے تعمیری نتائج پیدا کرنیوالی مثبت حقیقت لایا ہو۔ وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ ہم نے اپنے رسول کو شاعری نہیں سکھائی۔ نہ ہی شاعری اسے زیب دیتی ہے۔ ہم زندگی بخش حیات آفرین پیغام انقلاب کا حامل ہو اسے شاعری سے کیا واسطہ؟ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّقُرْاٰنٌ مُّبِيْنٌ یہ ان ابدی حقیقتوں کی یاد دہانی ہے جنہیں تم نے فراموش کر رکھا ہے۔ یہ ایک ضابطۂ زندگی ہے جو اپنی بات کو نہایت ابھرے اور نکھرے ہوئے انداز سے تمہارے

سامنے پیش کرتا ہے لِيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا وَيَحِقَّ الْقَوْلُ عَلَى الْكَافِرِينَ (۳۶/۷۰) تاکہ ہر اس شخص کو جس میں زندگی کی رمق باقی ہے غلط روش پر چلنے کے ہلاکت انگیز عواقب سے آگاہ کر دے۔ اور جو لوگ اس کے باوجود اسی (غلط) روش پر چلتے جائیں۔ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ جو کچھ اس نے کہا تھا وہ کس طرح حقیقت پر مبنی تھا۔ اس لئے کہ

إِنَّهُ لَقَوْلٌ فَصْلٌ وَمَا هُوَ بِالْهَزْلِ (۸۶/۱۳-۱۴)

یہ فیصلہ کن بات کرتا ہے۔ یونہی مذاق نہیں کرتا۔ چونکہ تم غور و فکر سے کام نہیں لیتے اسلئے اس کی عظمت کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ اسکی عظمت اور

قرآن کی عظمت

اثر انگیزی کا تو یہ عالم ہے کہ لَوْ أَنْزَلْنَا هَٰذَا الْقُرْآنَ عَلَىٰ جَبَلٍ لَّرَأَيْتَهُ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللَّهِ (۵۹/۲۱) اگر (مثال کے طور پر) ہم اسے قلبِ کوہ کے اندر رکھ دیتے اور اسے احساس عطا کر دیتے تو تو دیکھتا کہ اس کی خلاف ورزی کے ہلاکت آفریں نتائج کے احساس سے اسکی سختی کس طرح نرم پڑ جاتی۔ اور کس طرح اس کا جگر شق ہو جاتا۔ اسلئے کہ إِنَّهُ لَقَوْلٌ فَصْلٌ وَمَا هُوَ بِالْهَزْلِ۔

فَصْلٌ کے معنی ہوتے ہیں الگ الگ کر دینا۔ متمیز کر دینا۔ حق کو باطل سے جدا کر کے دکھا دینا۔ غلط کو صحیح سے الگ کر کے بتا دینا۔ اسی کے لئے دوسری جگہ کہا۔ حٰمٓ۔ وَالْكِتَابِ الْمُبِينِ۔ یہ ایک ایسا ضابطہ قوانین ہے جو خود بھی واضح اور صاف ہے۔ اور جو ہر بات کو

لیلۃ مبارکۃ

نہایت وضاحت اور صراحت سے اجاگر کر اور نکھار کر بیان کر دیتا ہے۔ إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةٍ مُّبَارَكَةٍ إِنَّا كُنَّا مُنذِرِينَ۔ ہم نے اس کا آغازِ نزول (رمضان کے مہینے کی ایک) ایسی شب میں کیا جو تمام نوعِ انسانی کے لئے نہایت برکت و سعادت کا موجب بن گئی ہے۔ یہ کتاب ہمارے اُس قانون (سنت اللہ) کے مطابق نازل ہوئی جس کی رو سے ہم شروع سے انسان کو اس کی غلط روش کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کرتے چلے آئے ہیں فِيهَا يُفْرَقُ كُلُّ أَمْرٍ حَكِيمٍ (۴۴/۴) اس میں ان تمام امور کو جو حکمت پر مبنی ہیں (غلط امور سے) الگ کر کے رکھ دیا گیا ہے۔

یہاں اسے لَيْلَةٍ مُّبَارَكَةٍ کہا ہے۔ دوسری جگہ ہے إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ ہم نے لَيْلَةُ الْقَدْرِ میں نازل کیا اگرچہ لیل کے معنی رات کے ہیں لیکن اس سے مراد وہ تمام زمانہ بھی ہو سکتا ہے جس میں قرآن نازل ہوتا رہا۔ اسے لیل سے اسلئے تعبیر کیا گیا کہ جس زمانے میں انسانوں کے پاس خدا کی وحی کی روشنی نہ رہے وہ اندھیری رات کی طرح تاریک ہوتا ہے۔ وحی کی روشنی آتی ہی تاریکیوں کے بعد ہے اس کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ نوعِ انسان کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لے آئے (يُخْرِجُهُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ ۵/۱۶) نیز اس سے مراد وہ دور بھی ہو سکتا ہے جس میں قرآن تو کسی قوم کے پاس موجود ہو۔ لیکن اس پر عمل نہ ہو رہا ہو (جیسا ہمارا دور ہے) بہرحال قرآن کا نزول تاریکی کے دور میں ہوا تاکہ ان انسانوں کے لئے جو دیکھ بھال کر راستہ چلنا چاہیں روشنی مہیا کر دے۔

لیلۃ القدر

دوسرا لفظ قدر ہے جس کے معنی ہیں پیمانہ۔ یعنی قرآن نے نوعِ انسانی کو حق و باطل کے ماپنے کے صحیح صحیح پیمانے عطا کئے ہیں۔ اس نے وہ مستقل اقدار (Permanent Values) دی ہیں جن کے مطابق زندگی بسر کرنا مقصودِ انسانیت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مستقل اقدار ہی وہ لنگر ہیں جن کے سہارے انسانی زندگی کی کشتی حوادثِ زمانہ کی طوفان انگیزیوں سے

محفوظ رہ سکتی ہے۔ یہ بات بآسانی سمجھ میں آجائے گی کہ خارجی کائنات کی ہر شے وہ کچھ بن جاتی ہے جس نگاہ سے ہم اسے دیکھیں۔ اقبال کے الفاظ میں

لے کہ منزل را ہمی دانی زراہ — قیمت ہر شے ز انداز نگاہ
نوع دیگر بیں جہاں دیگر شود — ایں زمین و آسماں دیگر شود

اگر آپ آزردہ دل ہیں تو لوگوں کی ہنسی اور خوشی سے آپ کو غصہ آئے گا۔ (غالباً) فانی نے کہا ہے کہ

عالم کی فضا پوچھو محروم تمنا سے — بیٹھا ہوا دنیا میں اٹھ جائے جو دنیا سے

اس کے برعکس اگر آپ خوش ہیں تو ساری دنیا آپ کو ہنستی اور ناچتی دکھائی دے گی۔ بقول اختر شیرانی

یہ کس کو دیکھ کر دیکھا ہے میں نے بزم ہستی کو — کہ جو شے ہے نگاہوں میں حسیں معلوم ہوتی ہے

مختصراً یوں کہ

میں اب سمجھا کہ دنیا کچھ نہیں دنیا مرا دل ہے — بدل جانے سے اس کے رنگ ہر اک چیز کا بدلا

یا یوں کہ

نہ کلی ہے وجہ نظر کشی نہ کنول کے پھول میں تازگی — فقط ایک دل کی شگفتگی سبب نشاط بہار ہے

لیکن اگر آپ دنیا کے معاملات کے فیصلے اسی معیار کے مطابق کرنے لگ جائیں تو مصیبت ہو جائے۔ جس دن آپ خوش ہوں اس دن مجرم بھی آپ کی عدالت سے صاف بری ہو جائیں۔ اور جس دن آپ بیگم صاحب سے لڑ کر آئے ہوں، اس دن بے گناہ بھی پھانسی پا جائیں۔ آپ کو شاید یاد ہو کہ مشہور روسی لیڈر لینن (روس کی تحریک سے پہلے) جرمن میں گرفتار ہو گیا تھا۔ جج نے فیصلہ یہ کرنا تھا کہ اسے موت کی سزا دی جائے یا ملک بدر کر دیا جائے۔ اس جج نے اسے ملک بدر کر دیا اور وہ سیدھا روس پہنچ گیا۔ اس پر لارڈ رسل نے لکھا ہے کہ اگر اس دن اس جج کو سوءِ ہضم (Dyspepsia) کی شکایت ہوتی تو آج دنیا کی تاریخ بالکل مختلف ہوتی۔ لہذا یہ اصول غلط ہے کہ فیصلے ایک فرد کی افتادِ طبع کے مطابق ہوں۔ معاملات کے فیصلوں کے لئے کوئی مستقل پیمانہ ہونا چاہیئے جو افراد کے مزاج اور طبائع سے قطعاً متاثر نہ ہو۔ ان پیمانوں کو مستقل اقدار کہتے ہیں جو وحی کی رو سے ملتی ہیں اور جن میں اور تو اور، خود نبی کے ذاتی خیالات و جذبات کا بھی کوئی دخل نہیں ہوتا (وما ینطق عن الھویٰ)۔ ان مستقل اقدار کو میزانِ زندگی بنانے والوں کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ

وہ تری گلی کی قیامتیں کہ لحد سے مردے اکھڑ گئے — یہ مری جبینِ نیاز ہے کہ جہاں دھری تھی دھری رہی

ان پر خارجی حوادث کی تلاطم خیزیوں اور طوفان انگیزیوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔

یہ ہے وہ لیلۃ القدر (مستقل اقدار والی رات) جس میں قرآن نازل ہوا۔ وَمَا أَدْرَاكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ لَيْلَةُ الْقَدْرِ خَيْرٌ مِّنْ أَلْفِ شَهْرٍ۔ اس حقیقت کو خدا کے سوا اور کون بیان کر سکتا ہے کہ وہ رات جس میں نزولِ قرآن کا آغاز ہوا اُس دور کی ہزار راتوں سے بہتر ہے جس میں انسان وحی کی روشنی سے محروم ہو۔ وہ دور جو قرآن کی روشنی سے منور ہو انسانی جہالت اور ظلمت کے ہزار زمانوں سے افضل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نزولِ قرآن سے انسانی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا ہے۔ بعثت محمدؐ

زمانۂ قبل از قرآن اور بعد از قرآن میں ایک دیوارِ فصل ہے جس سے دونوں دور نمایاں طور پر الگ الگ دکھائی دیتے ہیں۔ نزولِ قرآن کے بعد کے زمانے کی خصوصیت یہ ہے کہ تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا اس میں آہستہ آہستہ، قانونِ خداوندی کے مطابق ملائکہ اور الروح کا نزول ہوتا ہے۔

یہ آپ کو معلوم ہی ہے کہ ملائکہ سے مفہوم وہ کائناتی قوتیں ہیں جو خدائی پروگرام کو تکمیل تک پہنچانے میں سرگرم عمل رہتی ہیں آپ دیکھئے کہ کائناتی قوتوں کی کارفرمائیاں جس سرعت اور وضاحت سے زمانۂ بعد از قرآن میں بے نقاب ہوئی ہیں، زمانۂ قبل از قرآن کے ہزارہا سال میں اس کا عشرِ عشیر بھی انسانوں کے سامنے نہیں آسکا تھا۔

باقی رہا الروح۔ سو اس سے مراد خود وحی کی قوت ہے۔ اس ضمن میں بھی غور کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ جس تیزی سے (زمانہ بعد از قرآن میں) اقوامِ عالم غیر شعوری طور پر یعنی عقل کے تجربانی طریق سے) وحیٔ خداوندی (قرآن) کے قریب آتی جا رہی ہیں، اس سے پہلے دور میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ آپ دیکھئے کہ زمانۂ قبل از قرآن میں (مثلاً) ملوکیت۔ شخصیت پرستی۔ نسل پرستی۔ اسلاف پرستی۔ قومیت پرستی۔ ذات پات کی تمیز۔ علائی۔ پیشوائیت۔ سرمایہ داری جیسے عناصر انسانی زندگی کے مسلمات میں شمار ہوتے تھے۔ لیکن (زمانہ نزولِ قرآن کے بعد) دیکھئے کہ اقوامِ عالم کس طرح ان مسلمات کو آہستہ آہستہ چھوڑ چکی ہیں یا چھوڑتی چلی جا رہی ہیں۔

سلامتی ہی سلامتی

اس کے بعد قرآن یہ بتاتا ہے کہ کائناتی قوتوں کے عمل اور طریقِ کار کے بے نقاب ہونے اور وحیٔ خداوندی کے مطابق نظامِ زندگی کی تشکیل کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ اس کا نتیجہ ہوتا ہے مِنْ كُلِّ اَمْرٍ سَلٰمٌ۔ سلام ایک جامع لفظ ہے جس کے معنی امن و سلامتی بھی ہیں اور تکمیلِ ذات بھی۔ ضبطِ خویش بھی ہیں اور احترامِ آئین و قوانین بھی۔ قرآن کہتا ہے کہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کائنات کے ہر گوشے اور زندگی کے ہر شعبے میں سلام کی کیفیت پیدا ہو جائے گی۔ هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ (۹۷/۵) تا آنکہ رات کی تاریکیاں چھٹ کر ساری فضا صبح کی روشنی سے معمور ہو جائے۔ یہ نورانیت سب سے پہلے عہدِ محمد رسول اللہ والذین معہٗ میں وجہِ تابانی عالم ہوئی تھی جس سے زندگی کے تاریک سے تاریک گوشے بھی چمک اٹھے تھے۔ وہ انقلاب نبی اکرمؐ کی بے مثال قوتِ عمل اور بے نظیر سیرت و کردار سے ہنگامی طور پر (By Revolution) ظہور میں آگیا تھا لیکن اس کے بعد یہ انقلاب (بار دیگر) آہستہ آہستہ ارتقائی طور پر (By Evolution) رونما ہوگا جب انسان اپنے غلط تجارب کے تباہ کن نتائج سے متاثر ہو کر وحی کے بتائے ہوئے راستے پر آئیگا قرآن کا کہنا ہے کہ ایسا ہو کر رہیگا۔ اس دور میں۔

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش — اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائیگی
اس قدر ہوگی ترنم آفریں بادِ بہار — نکہت خوابیدۂ غنچے کی نوا ہو جائیگی
شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ جہاں معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا (۳۹/۶۹) اس وقت زمین اپنے پروردگار کے نور سے جگمگا اٹھے گی۔

کتاب مبین

یہاں قرآن نے مِنْ کُلِّ اَمْرٍ سَلَامٌ کہا ہے۔ سورۂ مائدہ میں ہے قَدْ جَآءَکُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّکِتٰبٌ مُّبِیْنٌ تمہاری طرف اللہ کی جانب سے ایک روشنی آگئی ہے۔ یعنی واضح کتاب۔ روشنی، خود روشن ہوتی ہے۔ یعنی اسے تلاش کرنے اور دیکھنے کے لئے کسی دوسری روشنی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اگر کسی کمرے میں جلتا ہوا چراغ رکھا ہو تو آپ یہ دیکھنے کے لئے کہ وہ چراغ کہاں رکھا ہے اور کیسا ہے۔ لالٹین لے کر نہیں جاتے۔ وہ چراغ اپنی روشنی سے آپ سب خود بتا دیتا ہے۔ اس کے لئے صرف دیکھنے والی آنکھ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی طرح قرآن کو سمجھنے کے لئے کسی خارجی ذریعے کی ضرورت نہیں۔ صرف عقل و فکر انسانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ کتاب مبین (واضح کتاب) ہے یَهْدِیْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلَامِ۔ اس کے ذریعے اللہ، ہر اس قوم کو جو اس کے قوانین کی اتباع کرے سلامتی (اسلام) کے راستوں کی طرف راہ نمائی کرتا ہے۔ یُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ۔ اور اپنے قانون کی رو سے انہیں تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لے آتا ہے وَیَهْدِیْهِمْ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (۵/۱۵-۱۶) اور زندگی کے توازن بدرجہ راستے کی طرف ان کی راہ نمائی کر دیتا ہے۔ یہاں صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ کہا ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل میں ہے اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ یَهْدِیْ لِلَّتِیْ هِیَ اَقْوَمُ (۱۷/۹) یقیناً یہ قرآن (کاروانِ انسانیت کی) اس راہ کی طرف راہ نمائی کرتا ہے جو اَقْوَم ہے۔ آپ کو قائم (وہ کھڑا ہوا) قیام۔ قیامت۔ تقویم (ساخت۔ ہیئت کذائی) قوام وغیرہ الفاظ کا علم ہی ہے۔ ان سب کی

اقوم

بنیاد میں توازن کا مفہوم مضمر ہوتا ہے۔ کھڑا وہی رہ سکتا ہے جس کا توازن درست ہو۔ قوام میں بھی اعتدال کا پہلو نمایاں ہوتا ہے اقوم کے معنی ہیں جس میں سب سے زیادہ تقویمی کیفیت ہو۔ جو توازن و تناسب کے اعتبار سے سب سے بہتر ہو۔ جو بہترین اعتدال کی حامل ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ کائنات کا سارا سلسلہ توازن Proportion اور تناسب (Ratio) پر چل رہا ہے۔ اگر کسی شے کے اجزا کے توازن و تناسب میں ذرا سا بھی فرق آجائے تو اس میں فساد ہی فساد رونما ہو جاتا ہے یہی تناسب و توازن انسانی معاشرہ کا بھی اصل الاصول ہیں۔ نیز جس کی (Ratio) درست ہو وہی معقول (Rational) ہے۔ لہٰذا قرآن اس راستے کی طرف راہ نمائی کرتا ہے جو خود قائم ہے اور دوسروں کے قیام کا ذریعہ۔ جس کا توازن و تناسب بہترین ہے۔ اور اس لئے وہ سرتاسر (Rational) ہے۔ اسی لئے اس کی اپیل بھی انسانی عقل و فکر سے ہے۔ اسی سے انسان کو حقیقی زندگی ملتی ہے۔ اور ایسی مشعلِ ہدایت جسے ہاتھ میں لے کر وہ ساری دنیا میں سیدھے راستوں پر جا سکتا ہے۔ سورۂ انعام میں ہے اَوَمَنْ کَانَ مَیْتًا فَاَحْیَیْنٰهُ۔ ذرا سوچو کہ ایک وہ شخص ہے جسے ہم نے موت کے بعد حیات نو عطا کی وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا یَّمْشِیْ بِهٖ فِی النَّاسِ اور ایسی قندیل ہدایت دی جس کی روشنی میں وہ دنیا کے تاریک ترین گوشوں میں نہایت امن و اطمینان سے چل پھر سکتا ہے۔ دوسرا شخص وہ ہے کَمَنْ مَّثَلُهٗ فِی الظُّلُمٰتِ

لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا (۶/۱۲۳) جس کے متعلق یوں سمجھو کہ وہ ایسی تاریکی میں ہے جس سے وہ نکل ہی نہیں سکتا۔ کیا یہ دونوں شخص برابر ہو سکتے ہیں؟

یہ ہے وہ قرآن، جس کے متعلق سورۂ یونس میں ہے کہ يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَتْكُم مَّوْعِظَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَشِفَاءٌ لِّمَا فِي الصُّدُورِ۔ اے نوعِ انسانی! تمہاری طرف تمہارے پروردگار کی طرف سے ایک ایسا ضابطۂ ہدایت آگیا جو غلط روشِ زندگی کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کر کے تمہیں اس سے روکتا ہے (وعظ کے یہی معنی ہیں) اور ان تمام بیماریوں کا علاج ہے جن سے انسان کی سیرت میں ضعف اور کردار میں پستی آجاتی ہے وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ اور جو لوگ اس کی صداقت پر یقین رکھتے ہیں انہیں سیدھی راہ کی طرف راہ نمائی کرتا اور سامانِ نشوونما بہم پہنچاتا ہے قُلْ بِفَضْلِ اللَّهِ وَبِرَحْمَتِهِ۔ اے رسول! ان سے کہو کہ اس قسم کا ضابطۂ حیات محض خدا کے فضل و کرم سے تمہیں مل گیا۔ ورنہ انسان کے بس کی بات ہی نہ تھی کہ اپنے کسب و ہنر اور عقل و خرد سے ان حقائق کو معلوم کر لیتا۔ اس کے بعد ہے۔

جشن مسرت

فَبِذَٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوا

پس تمہیں چاہیئے کہ اس گرانقدر نعمت اور بیش بہا عطیہ کے ملنے پر خوشیاں مناؤ۔ هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُونَ (۱۰/۵۸-۵۹) حقیقت یہ ہے کہ یہ نعمت دنیا بھر کی نعمتوں کے مقابل میں جنہیں انسان جمع کرتا رہتا ہے گرانقدر ہے۔ یہ اس تمام علمی سرمایہ سے بھی بہتر ہے جسے نوعِ انسانی آج تک جمع کر سکی ہے اور جو وراثتاً اس تک منتقل ہوتا چلا آرہا ہے۔ اس کی مثل و نظیر دنیا کے فکر و عمل میں کہیں نہیں مل سکتی۔

لہٰذا تم اس قرآن کے ملنے پر خوشیاں مناؤ۔ اس سے واضح ہے برادران! کہ رمضان اور اس کی عید درحقیقت نزولِ قرآن کا جشن ہے۔ یہ وہ تقریب ہے جو تمام نوعِ انسانی کے لئے یکساں اور مشترک طور پر جشنِ مسرت ہے۔ اس لئے کہ یہ نعمت کسی خاص قوم یا خاص ملک کی ملکیت نہیں۔ یہ تمام نوعِ انسانی کے لئے حیاتِ باشرف کا موجب اور امن و عافیت کا ضامن ہے۔ اصل یہ ہے کہ اقوامِ عالم نے ابھی سمجھا ہی نہیں کہ قرآن کیا ہے؟ جس دن ان کی سمجھ میں یہ بات آگئی ان کے نزدیک نزولِ قرآن کی تقریب سے بڑھ کر اور کوئی تقریب جشن و مسرت کا موجب نہیں سمجھی جائے گی۔ اس وقت ساری دنیا میں یہی ایک تقریب مشترک قرار پاجائے گی۔ یعنی نوعِ انسان کی فلاح و سعادت کی تقریب۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قرآن کے مطابق زندگی بسر کرنے سے عملی نقطۂ نگاہ سے انسان کو ملتا کیا ہے؟ مختصر الفاظ میں اس کا جواب یہ ہے کہ اس سے انسان کو وہ سب کچھ مل جاتا ہے جو اس کی موجودہ زندگی کو خوشگوار بنانے کے لئے ضروری ہے اور جس سے اس کے مرنے کے بعد کی زندگی انسانیت کی ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل بن جاتی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ انسان

بنیادی ضروریاتِ زندگی

کی موجودہ زندگی کو خوشگوار بنانے کا پہلا یہ قدم یہ ہے کہ اس کی بنیادی ضروریاتِ زندگی (Basic Necessities of Life) پوری ہوں۔ یہ زندگی کا کم از کم اور لابُدی مطالبہ ہے۔ جس فرد یا قوم کی طبعی ضروریاتِ زندگی پوری نہ ہوں وہ دیگر مسائلِ حیات کے متعلق کچھ سوچ ہی نہیں سکتی۔ دیکھئے! قرآن اس باب میں کیا کہتا ہے۔

سورۂ طٰہٰ کی ابتداء اس آیت سے ہوتی ہے۔

مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰى (۲۰/۲)

ہم نے تجھ پر قرآن اس لئے نازل نہیں کیا کہ تو شقاوت کی زندگی بسر کرے۔ شقاء کے معنی ہیں محرومی۔ بدنصیبی۔ یعنی قرآن اس لئے نازل کیا گیا ہے کہ تم محرومی اور بدنصیبی کی زندگی بسر نہ کرو۔ تمہیں جگر پاش مشقتیں نہ اٹھانی پڑیں۔

یہ ہے نزولِ قرآن کا اصولی مقصد۔ اب اس اصول کی عملی تشریح دیکھئے۔ اسے قرآن نے (اسی سورہ میں) قصۂ آدم کے تمثیلی انداز میں بیان کیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ آدم ایک جنتی زندگی میں تھا۔ ہم نے اس سے کہا کہ دیکھنا! تم نے کہیں شیطان کا فریب نہ کھا جانا[1]۔ اگر تم اس کے فریب میں آ گئے تو یہ تمہیں جنت سے نکلوا دے گا اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا فَتَشْقٰى (۲۰/۱۱۷) تم محروم اور بدنصیب رہ جاؤ گے۔ کن چیزوں سے محروم رہ جاؤ گے؟ ان چیزوں سے جو تمہیں اس وقت نہایت فراوانی سے حاصل ہیں۔ وہ چیزیں کیا ہیں؟ سنئے۔ اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى۔ اس جنت میں تجھے اس بات کی ضمانت حاصل ہے کہ تو نہ بھوکا رہے گا نہ ننگا۔ وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى (۲۰/۱۱۹) تجھے نہ یہاں پیاس کا خوف ہے نہ موسم کی گرمی سے بچنے کی فکر۔ اس میں تمہارے کھانے پینے کے لئے رزق۔ پہننے کے لئے کپڑا۔ رہنے کے لئے مکان۔ غرضیکہ تمام بنیادی ضروریاتِ زندگی اس طرح حاصل ہیں کہ ان کے لئے تمہیں مشقتیں نہیں اٹھانی پڑتیں۔ اگر تم نے اس روشِ زندگی کو چھوڑ دیا تو ان تمام چیزوں سے محروم رہ جاؤ گے۔

اس کے بعد ہے کہ آدم شیطان کے فریب میں آ گیا اور ان چیزوں سے محروم ہو گیا۔ جب اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا تو اس نے خدا سے عرض کیا کہ کیا یہ محرومی ابدی ہے یا اس سے بچ نکلنے کی بھی کوئی صورت ہے؟ جواب ملا کہ مایوس ہونے کی کوئی بات نہیں۔ اس محرومی سے نجات مل سکتی ہے۔ اس کی شکل یہ ہے کہ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى (۲۰/۱۲۳) تمہارے پاس میری طرف سے راہ نمائی آئے گی۔ سو تم میں سے جو بھی اس راہ نمائی کے پیچھے پیچھے چلے گا تو نہ اس کی کوششیں رائگاں جائیں گی۔ اور نہ ہی وہ محروم رہے گا (لَا يَشْقٰى)

اس کے برعکس وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا۔ جو ہمارے قانون سے اعراض برتے گا تو اس

---

[1] آدم۔ شیطان۔ ابلیس۔ آدم کی جنتی زندگی وغیرہ کے مفہوم کے لئے کتاب "ابلیس و آدم" دیکھئے۔

کی معیشت تنگ ہو جائے گی (اتنا ہی نہیں بلکہ) وَنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى (۲۰/۱۲۴) اور اسے ہم قیامت کے دن اندھا اٹھائیں گے۔

یعنی سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ جو قوم قرآن کے قوانین کی اتباع کرے گی وہ بنیادی ضروریاتِ زندگی سے کبھی محروم نہیں رہے گی۔ اور جو اس سے اعراض برتے گی اس کی معیشت تنگ ہو جائے گی۔ اس لئے کہ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ (تَشْقٰى (۲۰/۲) قرآن اس لئے نازل نہیں کیا گیا کہ اس کی اتباع کرنے والے بنیادی ضروریاتِ زندگی سے محروم رہ جائیں۔

لیکن اس میں صرف طبعی ضروریاتِ زندگی کے بافراط مہیا ہو جانے کے متعلق ہی ہدایات نہیں۔ یہ ایک مکمل ضابطۂ

مکمل ضابطۂ حیات

ہدایت ہے جس میں انسانی زندگی کے ہر گوشے اور نظامِ حیات کے ہر شعبے کے متعلق راہ نمائی موجود ہے وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا (۶/۱۱۵) (اس میں) تیرے پروردگار کا قانون صدق و عدل کے ساتھ مکمل ہو گیا۔ اور اس طرح مکمل ہو گیا کہ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ۔ اس میں کوئی شخص کسی قسم کا ردّ و بدل نہیں کر سکتا۔ اس لئے کہ یہ (معاذ اللہ) کسی اندھی گونگی فطرت کا مدون کردہ ضابطۂ زندگی نہیں۔ یہ اُس خدا کا عطا کردہ قانونِ حیات ہے جو سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (۶/۱۱۵)

اس کے مکمل ہونے کی کیفیت یہ ہے کہ خدا کی طرف سے جس قدر قوانینِ زندگی مختلف زمانوں میں نازل ہوتے رہے وہ سب کے سب اس کے اندر آ چکے ہیں مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ (۵/۴۸) یہ ان تمام صداقتوں کو سچ کر کے دکھلانے والا اور ان کا محافظ و نگہبان ہے فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ (۹۸/۳) اس میں تمام محکم اور متوازن قوانین جمع ہو گئے ہیں۔

پھر جس خدا نے اسے مکمل کیا ہے اس نے اس کی حفاظت کا بھی ذمہ لیا ہے۔

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (۱۵/۹)

یقیناً ہم نے اس قرآن کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔

اس طرح محافظ کہ لَا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ (۴۱/۴۲) باطل نہ اس کے آگے سے آ سکتا ہے نہ پیچھے سے۔ جس راہ نمائی کو تمام نوعِ انسانی کے لئے ہمیشہ کے لئے ضابطۂ حیات بننا ہو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ محفوظ رہے۔ محفوظ رہے انسانی خیالات و تصورات کی اثر اندازی سے۔ اور اس کی یہی صورت ہے کہ

محفوظ بھی

اس کے الفاظ میں نہ کسی قسم کا تغیر و تبدل ہو، نہ کوئی حک و اضافہ۔ قرآن کا ایک ایک لفظ وہی ہے جو نبی اکرمؐ نے خدا سے پا کر امت کو دیا تھا۔ اس میں نہ ایک لفظ زائد ہے نہ منسوخ۔ نہ بدلا ہوا ہے نہ بگڑا ہوا۔

اس قسم کے ضابطۂ حیات کی بنیادی خصوصیت یہ بھی ہونی چاہیے کہ اس میں نہ کوئی اختلاف ہو نہ تضاد۔ قرآن نے اپنے منجانب اللہ ہونے کی دلیل ہی یہ بیان کی ہے کہ اس میں کہیں اختلاف نہیں اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ کیا یہ لوگ

قرآن میں غور و تدبر نہیں کرتے؟ اگر یہ لوگ غور و فکر سے کام لیں تو یہ حقیقت بے نقاب ہو کر سامنے آجائے کہ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا (۴/۸۲) اگر یہ خدا کے علاوہ کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں بہت سے اختلافات ملتے۔ یعنی، اس میں کسی اختلاف کا نہ ہونا اس امر کی دلیل ہے کہ یہ خدا کی کتاب ہے۔

کوئی اختلاف نہیں

آپ نے اکثر لوگوں کو یہ کہتے سنا ہوگا کہ مسلمانوں میں جس قدر فرقے ہیں، ان میں سے ہر ایک فرقہ اپنے اپنے مسلک و مشرب کی تائید قرآن سے لاتا ہے۔ اگر صورتِ حال فی الواقع ایسی ہو۔ یعنی قرآن کریم اس قدر باہمد گر مخالف فرقوں میں سے ہر ایک کی تائید بہم پہنچا دیتا ہو، تو لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا (قرآن میں بے شمار اختلافات ہونے) کی اس سے بڑھ کر اور دلیل کونسی ہو سکتی ہے؟ لہٰذا یہ غلط ہے کہ قرآن سے مختلف فرقوں کے باہمد گر متضاد عقائد و مسالک کی تائید مل سکتی ہے قرآن تو مختلف فرقوں کے وجود کو شرک قرار دیتا ہے (۳۰/۳۱-۳۲) اس لئے اس سے ان کی تائید کیسے مل سکتی ہے؟ قرآن، خدا کا دین پیش کرتا ہے جو ایک غیر منقسم وحدت (Indivisible Unit) ہے اور اس میں کسی قسم کا کوئی اختلاف نہیں۔ لیکن یہ حقیقت (جیسا کہ قرآن نے خود کہا ہے) تدبر فی القرآن سے سامنے آسکتی ہے۔ اندھی تقلید سے نہیں۔

قرآن کو سمجھنے کا طریقہ

لیکن تدبر فی القرآن کا طریقہ وہی ہونا چاہیئے جسے قرآن نے خود تجویز کیا ہے۔ سورۂ یونس میں ہے بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ وَلَمَّا يَأْتِهِمْ تَأْوِيْلُهٗ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيْنَ (۱۰/۳۹) ان لوگوں کو دیکھو یہ قرآن کی تکذیب کرتے ہیں۔ بغیر اس کے کہ اس کے حقائق کو اپنے علم کے احاطہ میں لیں۔ لہٰذا قرآن کے سمجھنے کا پہلا طریقہ یہ ہے کہ انسانی علم جس سطح تک پہنچ چکا ہو۔ انسان اس کی روشنی میں قرآنی حقائق کا مطالعہ کرے۔ جس شخص کے سامنے اس کے اپنے زمانے تک کا تمام علم نہ ہو۔ وہ قرآنی حقائق کو سمجھ ہی نہیں سکتا۔ جو علم و عقل سے کام نہ لے، قرآن کی بارگاہ سے اس پر پھٹکار پڑتی ہے وَيَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ (۱۰/۱۰۰)

دوسرا طریقہ (جو درحقیقت پہلے طریق ہی کا جزو لازم ہے) یہ ہے کہ (فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيْنَ) انسان، اقوامِ گذشتہ کی تاریخ سے دیکھے کہ کس قوم نے کونسا راستہ اختیار کیا اور اس کا انجام کیا ہوا۔ گویا جس انسان کے سامنے اقوامِ سابقہ سے متعلق تاریخی شواہد، اور اپنے زمانے کے تقاضے نہ ہوں وہ قرآنی حقائق کا ادراک نہیں کر سکتا۔

اور تیسرا طریق، عمل سے متعلق ہے۔ یعنی قرآنی نظام کو عملاً متشکل کر دیا جائے۔ اس کے بعد اس کے نتائج (تَأْوِيْلُهٗ) سے اس کے دعاوی کی صداقت خود بخود سمجھ میں آجائے گی۔ لیکن جو شخص نہ ماضی (تاریخ) اور حال (عصرِ حاضر) سے متعلق علم رکھتا ہو اور نہ ہی قرآنی نظام کو متشکل ہونے دے۔ نہ اس کا انتظار کرے وہ قرآن کو سمجھ نہیں سکتا۔

اوپر کہا گیا ہے کہ جس سطح تک انسانی علم پہنچ چکا ہو، وہ انسان کے سامنے ہونا چاہیئے۔ اس کے بغیر قرآن سمجھ میں نہیں

آسکتا۔ اس حقیقت کو قرآن نے دوسری جگہ اس طرح بیان کیا ہے سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ (۴۱/۵۳)، ہم ان لوگوں کو عالم انفس و آفاق میں اپنی نشانیاں دکھلاتے جائیں گے تاکہ یہ بات نکھر کر ان کے سامنے آجائے کہ قرآن کی الواقعہ ایک حقیقتِ ثابتہ ہے۔ یعنی قرآنی حقائق، زمانہ کی لہروں میں۔ کائنات کے پیچ و خم میں۔ لپٹے ہوئے ہیں۔ جب انسانی علم و تحقیق کا کوئی گوشہ اتنا بلند ہو جائے کہ کسی لہر کو جا کر چھوئے، تو اس میں چھپی ہوئی حقیقت، عروسِ نو کی طرح مسکراتی ہوئی بے نقاب ہو جاتی ہے۔ اس طرح قرآن کے حقائق آہستہ آہستہ مشہود ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اقبال کے الفاظ ہیں۔

چوں مسلماناں اگر داری جگر — در ضمیرِ خویش دور قرآں نگر
صد جہانِ تازہ در آیاتِ اوست — عصرہا پیچیدہ در آناتِ اوست
یک جہانش عصرِ حاضر را بس است — گیر اگر در سینہ دل معنی رس است
بندۂ مومن ز آیاتِ خداست — ہر جہاں اندر برِ او چو قباست

چوں کہن گردد جہانے در برش
می دہد قرآں جہانے دیگرش

اس سے ظاہر ہے کہ جو حقائق اس طرح زمانے کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ بارز اور مشہود ہوتے ہوں ان کے متعلق یہ سمجھنا صحیح نہیں کہ کسی ایک زمانے میں ان سب کا احاطہ کیا جا سکتا ہے۔ ہم قرآنی حقائق کو اپنے زمانے کے علم کی روشنی ہی میں سمجھ سکتے ہیں۔ ہمارے بعد جب علم انسانی کی سطح اور اونچی ہو جائے گی تو قرآن کی کئی ایسی حقیقتیں جو ہمارے زمانے میں ہنوز بے نقاب نہیں ہوئیں، منکشف ہو کر سامنے آجائیں گی۔ یہ سلسلہ جاری رہے گا حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ۔ یہ اس لئے کہ قرآن اس خدا کا کلام ہے جس کی نگاہوں سے کوئی حقیقت پوشیدہ نہیں أَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ أَنَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ (۴۱/۵۳)۔ واضح رہے کہ یہ چیز قرآن کے مجرد حقائق (Abstract Truths) کے متعلق ہے جن کے اسرار و غوامض زمانہ کی سطح کے ساتھ ساتھ کھلتے جاتے ہیں جہاں تک قرآن کے احکام کا تعلق ہے وہ اپنی جگہ متعین ہیں اور محکم۔ البتہ ان کی حکمت اور غایت کے سمجھنے میں زمانے کی علمی ترقی کے ساتھ وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔ قرآن فہمی کے ضمن میں اس نکتہ کو ہمیشہ سامنے رکھنا چاہیئے۔

انسان کا صحیح مقام

اگر کوئی پوچھے کہ وہ سب سے بڑی چیز جو قرآن نے انسان کو دی ہے (اور جو انسان کو کہیں اور نہیں مل سکتی تھی) کیا ہے، تو ایک مختصر سے فقرہ میں اس کا جواب یہ ہوگا کہ قرآن نے انسان کو اس کے صحیح مقام سے آگاہ کیا ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ جہاں تک خارجی کائنات کا تعلق ہے، ہر شے اس کے لئے تابع تسخیر کر دی

گئی ہے سَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مِّنْهُ. إِنَّ فِي ذٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ (۴۵/۱۳) آدم کے مسجود ملائکہ ہونے کا یہی مطلب ہے باقی رہے خود انسان۔ تو یہ سب پیدائش کے اعتبار سے یکساں طور پر واجب التکریم ہیں (وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ ۔ ۱۷/۷۰) اس لئے کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ کسی دوسرے انسان کو اپنا محکوم اور تابع فرمان بنالے (۳/۷۹) اس کے لئے صرف ان قوانین کی اتباع کی ضرورت ہے جو اس کی ذات کی نشوونما کے لئے خدا کی طرف سے عطا ہوئے ہیں۔ ان قوانین کے علاوہ، یہ اور کسی ضابطہ یا آئین کا پابند نہیں۔ قرآن نے واضح الفاظ میں کہدیا کہ اِتَّبِعُوا مَا أُنْزِلَ إِلَيْكُمْ مِنْ رَبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوا مِنْ دُونِهِ أَوْلِيَاءَ (۷/۳) تم صرف ان قوانین کی اتباع کرو جو تمہارے نشوونما دینے والے کی طرف سے تمہاری جانب بھیجے گئے ہیں۔ ان کے علاوہ اور کسی کارساز و کارفرما کی اتباع نہ کرو۔ آپ غور کیجئے کہ یہ کتنی بڑی آزادی ہے جو انسان کو عطا کی گئی ہے۔ دنیا میں انسان کی انتہائی آرزو یہ ہے کہ وہ آزاد ہو۔ آزادی کی خاطر وہ اپنی جان تک بھی دیدیتا ہے۔ اس کی ساری تاریخ، حصولِ آزادی کی کشمکش کی داستان ہے۔ لیکن اس تمام سعی و کاوش، تگ و تاز۔ اور تپش و گداز کے باوجود یہ آج تک متعین نہیں کر سکا کہ

صحیح آزادی

آزادی کہتے کسے ہیں۔ اسے یہ چیز قرآن ہی نے بتائی ہے کہ آزادی کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا محکوم نہ ہو۔ کوئی فرد کسی دوسرے فرد کا محتاج نہ ہو۔

کس نباشد در جہاں محتاجِ کس نکتۂ شرعِ مبین این است و بس

قرآن نے بعثتِ محمدیہ کا مقصد ہی یہ بتایا ہے کہ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ (۷/۱۵۷) وہ نوعِ انسانی کو ان زنجیروں سے آزاد کرائے گا جن میں وہ جکڑے ہوئے چلی آرہی تھی اور وہ بوجھ اس کے سر سے اتار دے گا جن کے نیچے وہ دبے ہی تھی۔ قرآن نے ان تمام اطواق و سلاسل کو توڑ کر رکھ دیا جو صدیوں سے انسان کی آزادی کو سلب کئے ہوئے تھے۔ خواہ یہ سلاسل ملوکیت کے استبداد کی شکل میں تھے یا پیشوائیت کے تقدس کے رنگ میں۔ خواہ یہ حسب و نسب اور رنگ و نسل کی تفریق کی صورت میں تھے یا اقتصادی طور پر طبقاتی تقسیم کے پیکر میں۔ قرآن نے ان تمام زنجیروں کو توڑ کر انسان کو اس قابل بنا دیا کہ وہ آزادی کی فضائے بسیط میں کھلا سانس لے سکے اور اس طرح کائنات میں اپنے صحیح مقام سے آگاہ ہو جائے۔

یہ تھا وہ جو قرآن نے دیا۔ لیکن اس کی حامل اُمت نے جو کچھ (اس کے باوجود) اپنے ساتھ کیا اُس کے تصور سے روح کانپ اٹھتی ہے۔ اس نے ان زنجیروں کے ایک ایک ٹکڑے کو جنہیں قرآن نے اس طرح توڑا تھا، تلاش کر کے اپنی مژگانِ عقیدت سے اٹھایا اور نہایت تعظیم و احترام سے انہیں پھر سے اپنے گلے میں ڈال لیا۔ اقبال کے الفاظ میں۔

خود طلسمِ قیصر و کسریٰ شکست خود سرِ تختِ ملوکیت نشست
تاجہانِ سلطنت قوت گرفت دینِ او نقش از ملوکیت گرفت

چنانچہ آج حالت یہ ہے کہ

منزل و مقصودِ قرآں دیگر است — رسم و آئینِ مسلماں دیگر است
در دلِ او آتشِ سوزندہ نیست — مصطفٰےؐ در سینۂ او زندہ نیست

ہم اور قرآن

اس کی یہ حالت کیوں ہوئی۔ اس کے متعلق زبانِ وحی نے خود بتا دیا کہ یٰارَبِّ اِنَّ قَوْمِی اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا (۲۵/۳۰) اس قوم نے نہ صرف اپنے آپ کو اپنی خود ساختہ زنجیروں میں جکڑ لیا بلکہ قرآن کو بھی غیروں سے مستعار نظریات و تصورات کی رسیوں سے اس طرح باندھ دیا کہ وہ آزادانہ ایک قدم چلنے کے قابل نہ رہا۔ جانے والوں نے قرآن کے ساتھ یہ کچھ کیا اور آنے والوں کے نزدیک ان جانے والوں کی یہی روش دین میں سند قرار پا گئی۔ چنانچہ اب حالت یہ ہے کہ اِذَا قِیْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَیْهِ اٰبَآءَنَا۔ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ خدا نے نازل کیا ہے اس کی اتباع کرو۔ تو یہ کہتے ہیں کہ نہیں! ہم تو اس مسلک کی اتباع کریں گے جس پر ہم نے اپنے اسلاف کو چلتے دیکھا ہے۔ اسکے جواب میں قرآن کہتا ہے کہ اَوَلَوْ كَانَ الشَّیْطٰنُ یَدْعُوْهُمْ اِلٰى عَذَابِ السَّعِیْرِ (۳۱/۲۱) خواہ اس طرح شیطان انھیں جہنم کے عذاب کی طرف دعوت کیوں نہ دے رہا ہو، یہ اُسی راستے پر چلیں گے! اس کے بعد قرآن کہتا ہے کہ ان سے کہو کہ دین کی راہ اندھی تقلید نہیں۔ اس کی راہ یہ ہے کہ مَنْ یُّسْلِمْ وَجْهَهٗۤ اِلَى اللّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ جو شخص اپنے آپ کو خدا کے قوانین کے سامنے جھکا دے اور اس طرح حسن کارانہ انداز سے زندگی بسر کرے فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى (۳۱/۲۲) اس نے ایک ایسا سہارا تھام لیا جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتا۔

لیکن اسلاف پرستی کی جذباتی شدت انسان کے دل میں اس حد تک مخاصمت پیدا کر دیتی ہے کہ وہ قرآن کی آواز کو سننا تک گوارا نہیں کرتا۔ یہی نہیں کہ وہ خود اس کی آواز کو سننا نہیں چاہتا بلکہ اپنے متبعین کو بھی تاکید کرتا ہے کہ لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِیْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ (۴۱/۲۶) اس قرآن کی آواز کو قطعاً اپنے کانوں میں نہ پڑنے دو اور نہ ہی اسے کسی اور کو سننے دو۔ جہاں اس کی آواز اٹھے تم کائیں کائیں کرنے لگ جاؤ خوب شور مچاؤ۔ نعرے بلند کرو۔ فتوے لگانا شروع کر دو۔ ہو سکتا ہے کہ تم اس طرح ان لوگوں پر غالب آجاؤ جو قرآن کی طرف دعوت دیتے ہیں۔

آج ہماری یہ حالت ہو چکی ہے اس قرآن کے متعلق جس پر ایمان لانے سے ہم مسلمان کہلاتے ہیں۔ اور اس کا نتیجہ بھی ظاہر ہے! وہی قوم جسے اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ کہا گیا تھا (یعنی دنیا میں سب پر غالب) وہ آج دنیا میں سب سے ذلیل ہے اور دربدر دھکے کھا رہی ہے مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا اور مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا (۱۷/۲۹) دھتکاری اور پھٹکاری ہوئی۔ واماندہ اور درماندہ۔ جنت سے نکلے ہوئے آدم کی طرح حیران اور پریشان۔ مایوس اور محروم۔

پس چہ باید کرد

لیکن یہ مایوسی اور محرومی پھر سے شادکامی اور سرفرازی میں بدل سکتی ہے بشرطیکہ ہم پھر اُسی

قرآن کی طرف آجائیں جس نے ہمیں ایک بار وہ سربلندی و کامرانی عطا فرمائی تھی جس کی مثال انسانیت کی تاریخ میں کہیں نہیں مل سکتی۔ اس نے جنت سے نکلتے ہوئے آدم سے کہا تھا کہ فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُم مِّنِّي هُدًى فَمَن تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (۲/۳۸) جو قوم بھی خدا کی طرف سے ملی ہوئی راہنمائی کی اتباع کرے گی اسے نہ کسی قسم کا خوف ہوگا نہ حزن۔ نہ سرگردانی ہوگی نہ پریشانی۔

یہ ہے برادرانِ عزیز! اس قرآن کا اجمالی سا تعارف جس کے متعلق خود خدا نے کہا ہے کہ اس کے ملنے پر جشن مسرت مناؤ کہ یہ دنیا کی ہر نعمت سے زیادہ گراں بہا اور ہر دولت سے زیادہ بیش قیمت ہے۔ قُلْ بِفَضْلِ اللَّهِ وَبِرَحْمَتِهِ فَبِذَٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوا هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُونَ (۱۰/۵۸)

آں کتاب زندہ قرآن حکیم — حکمت او لایزال است و قدیم
نسخۂ اسرار تکوین حیات — بے ثبات از قوتش گیرد ثبات
پختہ تر سودائے خام از زور او — در فتد با سنگ جام از زور او
می برد پابند و آزاد آورد — صید بنداں را بفریاد آورد
ارج می گیرد از و نا ارجمند — بندہ را از سجدہ سازد سربلند

نوع انساں را پیام آخریں
حامل او رحمۃ للعالمیں

رشک صد عید ہے وہ ساعت جس میں دنیا کو ایسا پیام حیات ملا اور در خور ہزار تہنیت ہے وہ امت جسے اس پیام کی وراثت کے لئے منتخب کیا گیا (۳۵/۳۲)

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است — ایں کتابے نیست چیزے دیگر است
چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود — جاں چو دیگر شد جہاں دیگر شود

قرآنی فیصلے

رُوحانیت

(چند اہم اشارات)

قرآن نے باطل تصوراتِ زندگی اور ان کے مظاہر کے متعلق کہا ہے کہ اِنْ هِیَ اِلَّآ اَسْمَآءٌ سَمَّیْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُكُمْ یہ صرف کچھ نام (اسماء) ہیں جو تم نے خود رکھ لئے ہیں یا تمہارے آباؤ اجداد سے تمہاری طرف متوارث آ گئے ہیں۔ تم نے ان اسماء کی کنہ و حقیقت پر کبھی غور نہیں کیا۔ تم نے ان کے معانی متعین کرنے کی کوشش نہیں کی۔ تم نے کبھی انھیں Define کرنے کی طرف توجہ نہیں دی۔ اگر تم ان کا مفہوم اور معانی متعین کرنے کی کوشش کرتے۔ ان کی ماہیت اور حقیقت سمجھنے کی فکر کرتے تو تم پر بات واضح ہو جاتی۔ پھر تم ان لفظوں کے فریب میں نہ آتے تم جو کچھ کرتے سوچ سمجھ کر کرتے۔

قرآن نے اس مختصر سے ٹکڑے میں ایک عظیم حقیقت کو بے نقاب کر دیا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ ہم اپنی زندگی میں اکثر و بیشتر ایسے الفاظ استعمال کرتے ہیں جن کا کوئی متعین مفہوم ہمارے ذہن میں نہیں ہوتا۔ نہ ہی ہم اس کی کبھی کوشش کرتے ہیں کہ ان کا مفہوم متعین کر لیا جائے۔ ہم ان الفاظ کو بلا تکلف و تامل استعمال کرتے رہتے ہیں۔ حالانکہ نہ بولنے والے کے ذہن میں ان کا متعین مفہوم ہوتا ہے نہ سننے والے کے۔

ظاہر ہے کہ عملی دنیا۔ یعنی دنیائے معاملات میں۔ اس قسم کے الفاظ کبھی نہیں بولے جا سکتے۔ اگر اس دنیا میں اس قسم کے الفاظ بولے جائیں تو ہمارا نظامِ زندگی ایک دن کے لئے بھی چل نہ سکے۔ جب ہم "پانی" کہتے ہیں تو ہمارے ذہن میں بھی اس کا ایک متعین مفہوم ہوتا ہے اور ہمارا ملازم جسے ہم پانی لانے کے لئے کہتے ہیں وہ بھی اسکے متعین مفہوم سے واقف ہوتا ہے۔ چنانچہ جب ہم اس سے کہتے ہیں کہ پانی لاؤ تو وہ پانی لے آتا ہے۔

اس قسم کے الفاظ کا استعمال جن کا مفہوم متعین نہیں ہوتا، مذہب، فلسفہ، ادب، شعر وغیرہ کی دنیا میں بکثرت ہوتا ہے۔ یعنی اُس دنیا میں جسے معاملات کی دنیا نہیں بلکہ "حقائق" کی دنیا کہا جاتا ہے۔ حیرت ہے کہ ہم اسے کہتے تو ہیں حقائق (Reality) کی دنیا۔ لیکن اس میں جو الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ ان میں بیشتر ایسے ہوتے ہیں جن کے متعلق یہ بھی متعین نہیں ہوتا کہ ان کا حقیقی مفہوم (Real Significance) کیا ہے؟

یہی وجہ ہے کہ معاملات کی دنیا میں کبھی اس قسم کی (Confusion) پیدا نہیں ہوتی جس قسم کی Confusion

مثلاً مذہب یا فلسفہ کے گوشوں میں عام ملتی ہے۔ اس (Confusion) سے جس قدر فساد اور انتشار پیدا ہوتا ہے وہ ظاہر ہے ایسا انتشار کہ کسی ایک فرد کے نظریات و تصورات دوسرے فرد سے نہیں ملتے۔

اگر ان الفاظ کے مفہوم کو (جنھیں اس گوشے میں عام طور پر بولا جاتا ہے) متعین کر لیا جائے۔ اگر انھیں (Define) کر لیا جائے تو ہمارا بہت سا ذہنی انتشار اور نظری تشتت (اگر بالکل ختم نہ بھی ہو سکے تو بھی وہ) بڑی حد تک کم ہو سکتا ہے۔

اس قسم کے الفاظ میں ایک لفظ "روحانیت" بھی ہے انگریزی میں روحانی کو (Spiritual) کہتے ہیں۔ یہ لفظ مذہب اور فلسفہ دونوں میں بکثرت استعمال ہوتا ہے اور تصوف (Mysticism) کی تو گویا بنیاد ہی اسی پر ہے لیکن آپ حیران ہوں گے کہ اس قدر کثیر الاستعمال لفظ کا کوئی متعین مفہوم ہی نہیں۔ آپ چند مختلف افراد سے جن کے متعلق آپ سمجھتے ہوں کہ انھیں مذہب یا فلسفہ میں خاصا درک حاصل ہے، الگ الگ اس لفظ کا مفہوم پوچھئے۔ آپ دیکھیں گے کہ وہ یا تو اس کا کوئی متعین مفہوم بتا ہی نہیں سکیں گے اور اگر کوئی مفہوم بتائیں گے تو ایک کا بتایا ہوا مفہوم دوسرے سے ملے گا ہی نہیں۔ آپ اس کا تجربہ کیجئے اور پھر دیکھئے کہ اس سے کس قدر تعجب انگیز اور حیران کن نتائج سامنے آتے ہیں۔ صوفی تو یہ کہہ کر پیچھا چھڑائیں گے کہ ـــــ ذوق ایں بادہ ندانی بخدا تا نچشی ـــ روحانیت سمجھنے سمجھانے کی چیز نہیں۔ اسے تو محسوس ہی کیا جا سکتا ہے۔ (محسوس کا لفظ بھی صحیح نہیں اس کے لئے کہ روحانیت کا تعلق احساسات سے نہیں۔ یہ حواس سے ماورا ہوتی ہے) یہ واردات کی دنیا سے متعلق ہے۔ جس پر یہ کیفیت وارد ہو وہی جان سکتا ہے کہ یہ کیا ہے (جان سکتا ہے بھی غلط ہے کیونکہ جاننے کا تعلق علم سے ہوتا ہے اور روحانیت علم و عقل سے ماورا ہوتی ہے۔ اسے صرف پہچانا جا سکتا ہے۔ جانا نہیں جا سکتا)۔ یہ وہی چیز ہے جسے ولیم جیمز مذہبی تجربہ (Religious Experience) کہہ کر پکارتا ہے۔ اسے نہ سمجھا جا سکتا ہے نہ سمجھایا۔ اس کا ذاتی طور پر تجربہ کیا جا سکتا ہے اور بس۔ اس سے ظاہر ہے کہ تصوف کی دنیا میں لفظ "روحانیت" کا کوئی مفہوم متعین ہی نہیں کیا جا سکتا۔

مذہب کی دنیا میں روحانیت کا لفظ مادیت Materialism کے مقابل میں استعمال ہوتا ہے۔ اور مادیت کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ انسان دنیا کے دھندوں میں الجھ کر اور خدا کو بھلا دے۔ خدا کو یاد رکھنے سے مراد یہ ہوتی ہے کہ انسان مذہبی رسوم و شعار کا پابند رہے۔ خاص وضع قطع کی زندگی بسر کرے یا (زیادہ سے زیادہ) چند اخلاقی اقدار کی پابندی کرے۔ دوسروں سے ہمدردی کرے۔ خیرات بانٹے۔ کسی کا دل نہ دکھائے۔ نرم روی اور انکساری اختیار کرے۔ اس سے (وہ کہتے ہیں) انسان میں روحانیت پیدا ہوتی ہے یا اس کی روحانی ترقی ہوتی ہے۔ لیکن اگر ان سے پوچھا جائے کہ یہ بالآخر ہوتی کیا ہے، تو اس کا ان کے پاس بھی کوئی جواب نہیں ہوتا۔

فلسفہ کی دنیا میں بھی (Spirit) کا لفظ (Matter) یا مادہ کے مقابلہ میں استعمال ہوتا ہے[1]۔ اس سے

---

[1] اس مقام پر ہم صرف اس فلسفہ کا ذکر کر رہے ہیں جو روحانیت (Spiritualism) کا قائل ہے۔

ان کی مراد یہ ہوتی ہے کہ مادہ کی دنیا وہ ہے جو ہمارے حواس (Senses) کی زد میں آجاتی ہے۔ لیکن اس سے ماوراء ایک اور دنیا ہے جسے عالمِ نامشہود (Un-seen World) کہا جاتا ہے۔ یہ عالمِ محسوسات اُس عالمِ نامشہود کے مقابلہ میں کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ اس لئے کہ وہ عالم حقائق کی دنیا ہے۔ وہاں انسان حقیقت (Reality) یا صداقت (Truth) کا مشاہدہ کر سکتا ہے۔ "مشاہدہ" کا لفظ خاص اہمیت رکھتا ہے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ محسوسات کی دنیا کا علم عقل و فکر (Intellect) کے ذریعے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ لیکن عالمِ نامشہود کا براہِ راست مشاہدہ کیا جاتا ہے۔ وہ جاننے کی چیز نہیں دیکھنے کی ہے۔ دیکھنے کی بھی نہیں بلکہ وہ کچھ بن جانے کی۔ (One Lives It) آپ نے دیکھا ہوگا کہ اس مقام پر فلسفہ کے ڈانڈے تصوف سے مل جاتے ہیں۔ لہٰذا دونوں کا اعلان یہ ہوتا ہے کہ انسان کا ذریعۂ علم ظاہری حواس نہیں۔ بلکہ "روحانی حواس" (Spiritual Perception) ہیں۔ یہ علم کا باطنی ذریعہ ہے۔ اس سے انسان کی روحانی شمعیں روشن ہو جاتی ہیں اور ان کی روشنی میں وہ حقیقت کو بے نقاب دیکھ لیتا ہے۔ یہی یقینی علم ہے۔ اس تک پہنچ جانا انسانی فکر (Intellect) کے بس کی بات نہیں۔ اس یقینی علم کا حصول روحانیت ہے۔ یہ ایک انفرادی تجربہ (Individual Experience) ہے جسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔

آپ نے دیکھا کہ لفظ "روحانیت" کا مفہوم فلسفہ بھی متعین نہیں کر سکتا۔ اس کے معانی وہ بھی نہیں سمجھا سکتا۔ وہ بھی اسے انفرادی تجربہ ہی قرار دیتا ہے۔ یہ ہے اُس لفظ کے معانی و مفہوم کی کیفیت جو ہماری فضا میں چاروں طرف گونجتا رہتا ہے۔ اسی قسم کے ہیں وہ الفاظ جن کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ اِنْ هِيَ اِلَّآ اَسْمَآءٌ سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ یہ صرف نام ہی نام ہیں۔ جو تم نے یا تمہارے آباء و اجداد نے رکھ چھوڑے ہیں۔ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ۔ اللہ نے ان کے لئے کوئی سند نہیں نازل کی۔ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ۔ یہ صرف ظن و قیاس کی اتباع کرتے ہیں۔ علم و یقین کی نہیں وَمَا تَهْوَى الْاَنْفُسُ یا اپنے جذبات کی۔ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنْ رَّبِّهِمُ الْهُدٰى (۵۳/۲۳) حالانکہ ان کے رب کی طرف سے ان کے پاس (حقیقت کی) راہ نمائی آچکی ہے۔

اس آیۂ جلیلہ کے چند الفاظ میں قرآن نے ایسی اہم حقیقتوں کا احاطہ کر دیا ہے کہ جوں جوں نگہ بصیرت ان پر غور کرتی ہے اس کے سامنے علم و یقین کی ایک دنیا بے نقاب ہوتی چلی جاتی ہے۔ سب سے پہلے تو قرآن نے یہ کہا ہے کہ اس قسم کی باتیں کرنے والے علم و حقیقت کی رو سے باتیں نہیں کرتے۔ محض ظن و قیاس کے پیچھے چلتے ہیں۔ "ظن و قیاس" کا تعلق دنیائے فکر و تدبر سے ہے اس لئے قرآن نے کہا ہے کہ یہ لوگ فکر و تدبر کی رو سے کبھی نہیں بتا سکیں گے کہ ان اسمار کا مفہوم و منطوق کیا ہے۔ دوسری بات قرآن نے یہ کہی ہے کہ یہ لوگ اس قسم کے اسمار کی اتباع اس لئے کرتے ہیں کہ اس سے ان کے جذبات کی تسکین ہوتی ہے۔ یعنی یہ لوگ باتیں تو فلسفہ اور منطق کی کریں گے (جن کا تعلق خالص فکر کی دنیا سے ہے۔ فلسفہ (Philosophy) کے معنی ہی فکر سے وابستگی اور اُنس کے ہیں) لیکن درحقیقت ان کے اس مسلک کا تعلق اُن کے جذبات (Emotions) سے ہوتا ہے۔ آپ نے

دیکھا کہ یہ کتنی بڑی حقیقت ہے جسے قرآن اس طرح چلتے چلتے بیان کر گیا ہے۔

تیسری بات اس نے یہ کہی ہے کہ وَلَقَدْ جَاءَهُمْ مِنْ رَبِّهِمُ الْهُدٰى۔ ان تمام امور کے متعلق دیکھنا صرف یہ چاہیئے کہ خدا کی راہ نمائی کیا کہتی ہے۔ یعنی جب ایک مسلمان ان "اسماء" میں سے کسی کے متعلق بات کرے تو اسے یہ دیکھنا چاہیئے کہ اس باب میں قرآن کا فیصلہ کیا ہے۔ اگر وہ ان اسماء کا مفہوم متعین کرتا ہے تو ہمارے لئے صرف وہی مفہوم قابل قبول ہونا چاہیئے جو اس نے متعین کیا ہے۔ اور اگر وہ ان کا مفہوم متعین نہیں کرتا تو ہمیں صاف صاف کہہ دینا چاہیئے کہ مَا أَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطَانٍ اللہ نے اس کے لئے کوئی سند نازل نہیں کی۔

ان تصریحات کی روشنی میں ہمیں دیکھنا چاہیئے کہ قرآن کی رو سے "روحانیت" کی پوزیشن کیا ہے۔

کائنات کے متعلق قرآن نے بتایا ہے کہ ایک عالم خلق ہے جسے دنیائے محسوسات کہا جاتا ہے۔ یہ وہ دنیا ہے جو ہمارے حواس کی زد میں آتی ہے۔ اس کا علم تجربات و مشاہدات کی رو سے (انسانی عقل و فکر کے ذریعے) حاصل کیا جا سکتا ہے۔ یہ علم ہر صاحب عقل و فکر حاصل کر سکتا ہے۔

دوسرا عالم امر ہے جسے عالم غیر مشہود کہا جا سکتا ہے۔ یہ وہ عالم ہے جہاں کائنات مشہود سے متعلق تمام قوانین مرتب اور جملہ اقدار متعین ہوتی ہیں وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُومَ مُسَخَّرَاتٍ بِأَمْرِهِ (۷/۵۴) سورج، چاند، ستارے سب اُس کے امر سے مسخر ہیں۔

عالم خلق ہو یا عالم امر سب خدا کے قبضۂ قدرت میں ہیں أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ (۷/۵۴)

عالم امر کو عالم الغیب بھی کہا گیا ہے جس کے مقابل میں عالم الشہادۃ۔ یعنی دنیائے محسوس ہے۔ (۵۹/۲۲)

اوپر کہا جا چکا ہے کہ عالم شہادۃ کا علم، ہر صاحب عقل و فکر حاصل کر سکتا ہے۔ لیکن عالم غیب کا علم خدا کے سوا کسی کو نہیں۔ قُلْ لَا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ الْغَيْبَ إِلَّا اللّٰهُ (۲۷/۶۵)

اس عالم الغیب سے متعلق کچھ علم (جتنا خدا چاہے) ان انسانوں کو مل سکتا ہے جنہیں خدا اس مقصد کے لئے منتخب کرے۔ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهِ أَحَدًا۔ إِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَسُولٍ (۷۲/۲۶)

جن انسانوں کو اس طرح عالم الغیب کا علم دیا جاتا ہے انہیں نبی یا رسول کہتے ہیں۔ اور اس طرح علم ملنے کا نام وحی ہے ذٰلِكَ مِنْ أَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهِ إِلَيْكَ..... (۳/۴۴)

کسی انسان کو وحی اس کی اپنی کوشش سے نہیں مل سکتی يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهِ مَنْ يَشَاءُ (۲/۱۰۵) حتیٰ کہ جسے یہ وحی ملنے والی ہوتی ہے اسے اس کا علم و احساس تک نہیں ہوتا کہ اسے وحی کے لئے منتخب کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ خود نبی اکرمؐ کے متعلق ہے وَكَذٰلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ رُوحًا مِنْ أَمْرِنَا۔ اور اس طرح ہم نے تیری طرف وحی کو نازل کیا جو ہمارے "امر" سے متعلق

ہے وَمَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ. حالانکہ تو جانتا ہی نہ تھا کہ کتاب کسے کہتے ہیں اور ایمان کیا ہوتا ہے وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا (۴۲/۵۲) ہم نے اسے ایک ایسی روشنی بنایا ہے جس کے ذریعے ہم اپنے بندوں میں سے جسے چاہتے ہیں راستہ دکھا دیتے ہیں۔

اس سے ظاہر ہے کہ وحی کوئی فکری Intellectual یا منطقی (Logical) طریق (Process) نہیں یہ ایک وہبی چیز ہے جو کسی انسان کو خدا کی طرف سے براہِ راست اور بلاسعی و کاوش ملتی ہے۔ اس لئے اسے ہر انسان حاصل نہیں کر سکتا۔ یہ صرف نبی کو ملتی ہے۔

لیکن نبوت کا سلسلہ نبی اکرمؐ پر ختم ہو گیا۔ اس لئے اب وحی یعنی خدا کی طرف سے براہِ راست علم کسی انسان کو نہیں مل سکتا۔ لہٰذا اب انسان کے پاس علم کے ذرائع دو ہی رہ گئے۔ عالمِ امر کے متعلق جو کچھ قرآن نے کہہ دیا ہے۔ وہ۔ اور محسوس کائنات کے متعلق انسان کا فکر و تدبر۔ یعنی قرآن کی رو سے اب نہ حصولِ علم کا کوئی باطنی ذریعہ ہے اور نہ ہی کوئی انسان کائناتِ ناشہود کے متعلق اس سے زیادہ کچھ جان سکتا ہے جو قرآن بتاتا ہے۔ لہٰذا اب کہنا کہ حصولِ علم کا کوئی باطنی طریق بھی ہے جس سے انسان کائناتِ ناشہود کا مشاہدہ کر سکتا ہے یکسر غیر قرآنی تصور ہے اسلئے اگر روحانیت سے مراد اس قسم کا باطنی علم ہو تو یہ ان اسماء میں سے ہے جس کی سند خدا کے ہاں سے نہیں مل سکتی۔ یہ محض ظن و تخمین یا اتباعِ ہوی (جذبات کی اتباع) ہے حقیقت نہیں ہے۔

کہا جاتا ہے کہ وحیٔ نبوت کا دروازہ تو بیشک بند ہو چکا ہے لیکن کشف و الہام کا دروازہ کھلا ہے۔ جب پوچھئے کہ وحیٔ نبوت اور کشف و الہام میں فرق کیا ہے تو کہہ دیتے ہیں کہ وحی تو شریعت میں حجت ہوتی ہے اور کشف و الہام حجت نہیں ہوتا۔ لیکن یہ فرق تو ماننے والے کے نقطۂ نگاہ سے ہوا۔ اس سوال کا جواب تو نہ ہوا کہ ان دونوں کی ماہیت اور نوعیت میں کیا فرق ہے؟ آپ حیران ہوں گے کہ اس فرق کو کوئی نہیں بتا سکے گا۔ اس لئے کہ ان حضرات کے عقیدہ کے مطابق ماہیت اور نوعیت کے اعتبار سے ان دونوں میں فرق ہی نہیں ہوتا جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، وحی سے مطلب یہ ہے کہ انسان بلا فکری یا منطقی طریق کے براہِ راست خدا سے علم حاصل کرے۔ الہام میں بھی یہی صورت بتائی جاتی ہے۔ لہٰذا الہام کو براہِ راست علم تسلیم کر لینے کے بعد اس میں اور وحی میں کوئی فرق نہیں رہتا۔

اس کے جواب میں یہ کہا جاتا ہے کہ کشف اور الہام کے وجود سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ واقعات اس کا ثبوت بہم پہنچاتے ہیں ایسے لوگ موجود ہیں جو کشف و الہام کے ذریعے غیب کی باتیں بتا دیتے ہیں۔ اور یہ طریقہ فکری یا منطقی قطعاً نہیں ہوتا۔ لہٰذا یہ علم اُسی (Catagory) میں آجاتا ہے جس سے وحی متعلق ہے۔

سب سے پہلے تو یہ دیکھئے کہ یہ منطقی نتیجہ ہے کس قدر غلط اور پُر فریب۔ اس قضیہ کا صغریٰ کبریٰ یوں بنتا ہے کہ

(۱) وحی کا علم فکری اور منطقی طریق کا نتیجہ نہیں ہوتا۔
(۲) الہام بھی فکری اور منطقی طریق کا نتیجہ نہیں ہوتا۔

لہٰذا

وحی اور الہام کی نوعیت و ماہیت ایک ہے۔

بالفاظِ دیگر ان کا کہنا یہ ہے کہ

(۱) چونکہ پانی ٹھوس نہیں ہوتا۔ اور
(۲) آگ بھی ٹھوس نہیں ہوتی۔

لہٰذا

پانی اور آگ کی نوعیت اور ماہیت ایک ہی ہے۔

کس قدر رکیک اور کمزور ہے یہ منطقی قضیہ اور اس کا نتیجہ!

یہ درست ہے کہ بعض لوگوں سے اس قسم کی باتیں سرزد ہوتی ہیں جن کی کوئی منطقی یا فکری توجیہہ پیش نہیں کی جا سکتی۔ لیکن اس سے یہ کیسے ثابت ہو گیا کہ یہ چیز ایک ایسی قوت کا نتیجہ ہے جو از قبیلِ وحی ہے۔ انسان میں بعض ایسی قوتیں موجود ہیں جن کی نشوونما (Development) سے اس سے بڑی محیر العقول باتیں ظہور میں آ سکتی ہیں۔ ہپناٹزم، مسمریزم (Auto Suggestion) وغیرہ انہی قوتوں کی نشوونما کے طریق ہیں۔ ان سے ایسی ایسی باتیں ظہور میں آتی ہیں جنہیں دیکھ کر فکر اور منطق سرنگوں ہو جاتے ہیں۔ کشف و الہام کا تعلق ان چیزوں سے ہے نہ کہ وحی سے۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے وحی کی صورت میں ایک صاحبِ وحی کو اس کا علم و احساس تک نہیں ہوتا کہ اسے اس قسم کا علم ملنے والا ہے۔ برعکس اس کے ہپناٹزم اور مسمریزم کی طرح، کشف و الہام ذاتی ریاضتوں اور مراقبوں سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ یعنی یہ چیز کسب و ہنر سے پیدا کی جا سکتی ہے۔ یہ سب انسان کی قوتِ ارادی کی نشوونما کے کھیل ہیں۔ انہیں نہ خدا کی طرف سے حاصل ہونے والے علم سے کچھ تعلق ہے۔ نہ وحی سے کچھ واسطہ۔ اسے ہر شخص (مسلم و غیر مسلم) اپنے کسب و ہنر سے حاصل کر سکتا ہے۔ لہٰذا اسے "روحانیت" کہہ کر اس کے گرد تقدس کا ہالہ کھڑا کر دینا بہت بڑی خود فریبی اور اسے از قبیلِ وحی قرار دینا بہت بڑی گمراہی ہے۔ قرآن سے اس قسم کی چیزوں کی کوئی سند نہیں مل سکتی۔

ہمارے ہاں آجکل کچھ فیشن سا ہو رہا ہے کہ لوگ فلسفہ پر گفتگو کرتے کرتے جب "اسلامی فلسفہ" پر آتے ہیں تو اس کے متعلق کچھ اس قسم کی باتیں کرتے ہیں کہ عام فلسفہ کا مقصد یہ ہے کہ فکری اور منطقی طریق سے ادراکِ حقیقت کیا جائے لیکن یہ طریق غلط ہے۔ اسلامی فلسفہ یہ بتاتا ہے کہ ادراکِ حقیقت صرف روحانی مدرکہ Spiritual perception

کی رُو سے ہو سکتا ہے۔ یہ حصولِ علم کا ایک الگ سرچشمہ ہے جس کا تعلق باطن یا روح کی دنیا سے ہے۔ جب تک انسان اس دنیا میں نیا جنم نہیں لیتا، حقیقت تک نہیں پہنچ سکتا۔

اس کے بعد وہ اس دعوے کی تائید میں جھٹ نبوت کو پیش کر دیتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ایک ہی سانس میں غزالی اور رومی جیسے "حکماء اور صوفیا" کا نام لے لیتے ہیں۔ یعنی وہ کہتے یہ ہیں کہ

(۱) اسلامی فلسفہ میں فکری طور پر ادراکِ حقیقت نہیں کیا جاتا۔ بلکہ روحانی طور پر اس کا مشاہدہ کیا جاتا ہے۔

(۲) خود رسول اللہ نے حقیقت کے مشاہدہ کے لئے یہی طریق اختیار کیا تھا۔ اور

(۳) یہی طریق مسلم صوفیا اور متصوف حکماء اختیار کرتے ہیں۔

یہ ساری عمارت غلط اور باطل بنیادوں پر استوار ہے۔ یاد رکھئے کہ

(ا) نبی ادراک یا مشاہدۂ حقیقت کے لئے کوئی طریق اختیار نہیں کرتا۔ حقیقت اپنے آپ کو خود اس پر منکشف کرتی ہے۔ اسے زبانِ نبوت میں وحی کہا جاتا ہے۔

(ب) وحی میں نہ کوئی صوفی شریک ہو سکتا ہے۔ نہ حکیم۔ نہ ہی اسے فلسفہ سے کچھ واسطہ ہے نہ باطنیت سے کوئی تعلق۔

(ج) یہ بھی غلط ہے کہ صوفیا کا طریقِ انکشافِ حقیقت اُسی نوعیت کا ہوتا ہے جس نوعیت کی نبی کی وحی ہوتی ہے۔ فرق صرف درجہ (Degree) کا ہوتا ہے۔ وحی اپنی حقیقت۔ ماہیت۔ کیفیت اور نوعیت میں یکسر منفرد ہوتی ہے کوئی فکری طریق یا باطنی تجربہ اس کے قبیل سے نہیں ہو سکتا۔

(د) اسلام کے تفوق (Superiority) کی بنیاد ختمِ نبوت (یعنی بابِ وحی کے بند ہو جانے) پر ہے۔ اس لئے اب کسی ذریعۂ علم کو از قبیلِ وحی سمجھنا، ہر نبوت کے توڑ دینے کے مرادف ہے۔ قرآن کی رُو سے "اسلامی فلسفہ" (اگر کوئی چیز ہے تو صرف یہ ہے کہ) وحی کے بیان کردہ حقائق پر ایمان لایا جائے اور کائناتی شواہد سے، فکری طریق پر ان حقائق کی صداقت کو سمجھا اور سمجھایا جائے۔ اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ اسے "فلسفہ" نہیں کہا جا سکتا۔ تو اسے سمجھ لینا چاہیئے کہ پھر اسلام نے (مصطلح) فلسفہ دیا ہی نہیں۔ اس نے صرف "دین" دیا ہے۔

نیز اسے یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ دین کی رُو سے زندگی کا منتہیٰ "علم" (Knowledge) نہیں بلکہ عمل (Conduct) ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ قرآن کی رو سے علم کی بڑی عظمت ہے۔ لیکن علم حصولِ مقصد کا ذریعہ ہے۔ مقصود بالذات نہیں۔ مقصود بالذات عمل (Conduct) ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی اکرمؐ نے اپنے دعوے کی صداقت کے ثبوت میں یہ فرمایا کہ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّن قَبْلِهِ أَفَلَا تَعْقِلُونَ (۱۰/۱۶) میں نے تمہارے اندر اپنی عمر بسر کی ہے۔ کیا تم اس سے اندازہ نہیں لگا سکتے کہ اس قسم کی زندگی ایک سچے کی ہوتی ہے یا جھوٹے کی۔

پھر اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ کے ٹکڑے سے یہ بھی واضح ہے کہ قرآن جس قسم کی سیرت پیدا کرنا چاہتا ہے اُسے عقلی اور فکری طریق سے پرکھا اور پہچانا جا سکتا ہے۔ یعنی وہ کوئی ایسی روحانیت پیدا نہیں کرتا جسے، عقل کے چراغ گل کر کے باطن کی آنکھ سے دیکھا جا سکے۔ یہ روحانیت میں نیا جنم لینا نہیں۔ انسانی جنم کو اس کے صحیح مقام تک لے جانا ہے جس میں نہ باطن کی بھول بھلیاں ہوتی ہیں نہ روحانیت کے لفظی گورکھ دھندے۔ مسلمان کا ذہن جب تک ان غیر قرآنی مہمات سے پاک نہیں ہوتا، وہ اسلامی تصوراتِ زندگی کو بے نقاب دیکھ نہیں سکتا۔ لَا یَمَسُّہٗ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ۔ قرآن کا واضح ارشاد ہے۔

اس مقام پر صرف ان اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ عندالضرورت ان اشارات کی تفصیل کسی دوسرے وقت بیان کی جا سکے گی۔

پتے چرائے جا رہے ہیں

جو مقدس ادارے طلوع اسلام کی قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کے خلاف جہادِ عظیم میں مصروف ہیں انہوں نے اب یہ حرکت شروع کر دی ہے کہ طلوع اسلام کے خریداروں کے پتے کہیں سے چراتے ہیں اور ان پتوں پر اپنا لٹریچر بھیجتے ہیں۔ طلوع اسلام کے متعدد خریداروں نے اس امر کی شکایت کی ہے کہ ان کے پتے دوسروں کے ہاں کیسے پہنچ رہے ہیں۔ ہمیں خود اس پر تعجب ہے کیونکہ طلوع اسلام کے دفتر سے ان پتوں کا باہر چلے جانا ممکن نہیں۔ ہم نے بہرحال محکمہ ڈاک کے ذمہ دار حضرات کی توجہ اس طرف مبذول کرائی ہے۔ ممکن ہے کہ وہ اس کا سراغ لگا سکیں۔

بہرحال طلوع اسلام کے خریدار حضرات مطمئن رہیں کہ ادارہ کے اندر اس قسم کی نقب زنی نہیں ہو سکتی مخالفین کی اس قسم کی حرکات سے خریداران طلوع اسلام کو جو قلبی اذیت اور ذہنی کوفت پہنچ رہی ہے اس کا ہمیں بے حد افسوس ہے۔

ناظم ادارۂ طلوع اسلام
کراچی

مجلسِ اقبال

چودھواں باب ـــــ الوقت سیف

اب ہم مضامین کے اعتبار سے 'اسرارِ خودی' کے آخری باب پر آپہنچے ہیں۔ اس کے بعد ایک دعا پر اس کتاب کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ زیرِ نظر باب 'نہ صرف مثنوی اسرار و رموز میں' بلکہ اقبال کے سارے پیغام میں سب سے زیادہ مشکل (اور اقبال کے نزدیک) سب سے زیادہ اہم موضوع پر مشتمل ہے۔ یہ موضوع ہے زمان (Time) کی حقیقت۔ ایک عام انسان (Layman) یہ سنکر حیران ہوگا کہ وقت (Time) میں وہ کون سی بات ہے جسے اس قدر پیچیدہ، مشکل اور اہم بتایا جا رہا ہے۔ اس کا یہ استعجاب بالکل صحیح ہے۔ اس "وقت" میں جسے ہم گھڑی پر دیکھتے یا ماہ و سال کے پیمانوں سے ماپتے ہیں، فی الواقعہ کوئی چیز پیچیدہ یا مشکل نہیں۔ لیکن فلاسفرز کے نزدیک "وقت" (زمان) کا جو تصور ہے اس کی رُو سے اس مسئلہ سے زیادہ مشکل اور اہم مسئلہ اور کوئی ہے ہی نہیں۔ اُن کے نزدیک اس میں رازِ کائنات، اسرارِ حیات اور شئون خداوندی پوشیدہ ہیں۔ یہ مسئلہ مشکل آسان ہے کہ افلاطون سے لے کر اس وقت تک تمام نامور فلسفہ دانوں نے اس کے متعلق لمبی چوڑی بحثیں کی ہیں۔ لیکن اس کے بعد بھی جب ان سے پوچھا جاتا ہے تو وہ ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہہ دیتے ہیں کہ اسکی ماہیت کو نہ ہم خود کما حقہٗ سمجھ سکے ہیں نہ کسی کو کما حقہٗ سمجھا سکتے ہیں۔ ہمارے زمانے میں برگسان کا یہ خاص موضوع رہا ہے اور علامہ اقبال کو اس سے بڑی دلچسپی رہی ہے۔ ایسی دلچسپی کہ ان کی کوئی کتاب ایسی نہیں جس میں 'زمان' کے متعلق کچھ نہ کچھ لکھا نہ گیا ہو۔ اُن کے خطبات (ریکنسٹرکشن) کو تو یوں سمجھئے گویا نقطۂ ارتکاز ہی یہ موضوع ہے۔ چونکہ اُن کے نزدیک اس مسئلہ کا انسانی ذات سے بڑا گہرا تعلق ہے۔ اس لئے اسرارِ خودی میں اس کا ذکر لازمی تھا۔ اسے انہوں نے "الوقت سیف" کے عنوان کے تابع لکھا ہے۔ اس مقولہ کو انہوں نے امام شافعی کی طرف منسوب کیا ہے (ہمیں اس کا حوالہ نہیں مل سکا) بہرحال اگر امام شافعی نے یہ کہا بھی ہو تو علم معانی میں کہا ہوگا (کہ وقت شجرِ زندگی کو کاٹتا چلا جاتا ہے) اُن معانی کے اعتبار سے کہاں کہا ہوگا جو اقبال نے بیان کئے ہیں۔ امام شافعی سنہ ۱۵۰ھ میں عسقلان میں پیدا ہوئے تھے اور سنہ ۲۰۴ھ میں مصر (فسطاط) میں وفات پا گئے تھے۔ ان کی شہرت ایک محدث اور امام فقہ کی حیثیت سے ہے نہ کہ فلسفی کی حیثیت سے۔ فلسفہ کا ان کے ہاں پتہ بھی نہیں ملتا۔

ہمارے لئے یہ مشکل ہی نہیں، ناممکن ہے کہ اس مقام پر اقبال کے فلسفۂ زمان کی تفصیل بیان کر سکیں۔ اس کے لئے ایک ضخیم تصنیف کی ضرورت ہوگی۔ ہم اس مقام پر صرف چند موٹے موٹے اشارات تک اکتفا کرتے ہیں جو زیرِ نظر باب میں مندرج اشعار کے سمجھنے میں ممد و معاون ہو سکتے ہیں۔ اس مقام پر ان فلسفیانہ مباحث کی تفاصیل میں نہ جانے کی ایک وجہ تو عدم گنجائش ہے دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ ہم اسرارِ خودی کی زیرِ نظر تشریح فلسفہ داں طبقہ کے لئے نہیں کر رہے بلکہ عام قارئین کے لئے کر رہے ہیں جن کے لئے فلسفیانہ غوامض کا سمجھنا مشکل ہے۔

اقبال کے نزدیک زمان کا ایک مفہوم وہ ہے جسے Serial Time کہتے ہیں۔ یعنی وہ زمانہ جسے ہم ماضی حال مستقبل سے تعبیر کرتے ہیں اور جسے عرفِ عام میں "وقت" کہا جاتا ہے۔ اقبال کے خیال میں یہ زمان غیر حقیقی ہے اور اس کا تعلق ہماری خودی کے اس گوشے سے ہے جسے ادراک (Perception) یا شعور (Intellect) کہتے ہیں۔ خودی کے اس پہلو کو وہ (Efficient Self) کہہ کر پکارتے ہیں۔

زمان کا دوسرا مفہوم وہ ہے جسے وہ حقیقی زمان (Real Time) سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ زمان وہ ہے جو خارج میں موجود نہیں ہوتا بلکہ ہمارے ضمیر کی گہرائیوں میں پوشیدہ ہوتا ہے۔ اس کا تعلق ہماری خودی کے اس پہلو سے ہے جسے Appreciative Self کہا جاتا ہے۔ یہی اقبال کے نزدیک اصل زمان ہے۔ یہی زمان خدا کے سامنے ہے جس میں ماضی، حال، مستقبل کی بجائے ایک "مستقل حال" (Eternal NOW) ہے اور بس۔

اقبال کے ہاں تیسرا اہم نقطہ یہ ہے کہ اگر زمان کو ایک عضوی کُل (Organic Whole) کی حیثیت سے دیکھا جائے یعنی اسے لمحات و آنات میں نہ بانٹا جائے تو اسے تقدیر کہتے ہیں۔ تقدیر کے معنی ہیں کسی شے کا وہ کچھ بن جانا جو کچھ بننے کے لئے وہ پیدا ہوئی ہے۔ بالفاظِ دیگر اس کی تمام ممکنات (Potentialities) کا مشہود (Actualise) ہو جانا۔ یہی وہ نقطہ ہے جس کی رو سے زمان کا فلسفہ اقبال کے ہاں اس قدر اہمیت پا جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر انسان زمان کے اس تصور کو سمجھ لے تو وہ مجبور سے صاحبِ اختیار ہو جاتا ہے اور صاحبِ اختیار ہونا ہی شرفِ انسانیت ہے۔ اس نقطۂ نگاہ سے آپ سمجھنا چاہیں تو سیدھے سادے الفاظ میں یوں کہہ لیجئے کہ جس شخص کی خودی بیدار نہ ہو (اور اس لئے وہ زمانِ حقیقی کے بجائے ماضی، حال، مستقبل والے زمان کی قیود میں گھرا ہوا ہو) وہ صاحبِ اختیار نہیں ہو سکتا مجبور ہوتا ہے۔ زمان اس کا مرکب (گھوڑا) نہیں بلکہ راکب (سوار) ہوتا ہے۔ اس کے برعکس جس کی خودی بیدار ہو، وہ حقیقی زمان کو اپنے ضمیر کی گہرائیوں میں پا لیتا ہے اور اس طرح خارجی زمان کا راکب بن جاتا ہے۔ اس کو خودی کی لامتناہی قوت کہتے ہیں جس سے انسان حیاتِ جاوید حاصل کر لیتا ہے۔ "ماضی، حال، مستقبل" والے زمان کی قیود سے آزاد ہو جانے کا نام ہی حیاتِ جاوید ہے۔

اس مختصر سی تمہیدی تشریح کے بعد اشعار کی طرف آیئے۔ اتنا اور سمجھ لینا ضروری ہے کہ قرآن نے زمان وغیرہ کے

متعلق کوئی بحث نہیں کی۔ اس میں دہر کا لفظ دو جگہ آیا ہے۔ ایک سورۂ دہر (یا الانسان) میں جہاں کہا گیا ہے کہ هَلْ أَتَىٰ عَلَى الْإِنسَانِ حِينٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُن شَيْئًا مَّذْكُورًا (۷۶/۱) یقیناً انسان پر ایک وقت ایسا بھی آچکا ہے جب یہ کوئی قابل ذکر شے نہ تھا۔ اس میں دہر کے عام معانی (زمانہ یا وقت) کے ہیں دوسرا مقام سورہ جاثیہ میں ہے جہاں ان لوگوں کا خیال درج کیا گیا ہے جو زندگی کو اسی طبعی دنیا کی زندگی تصور کرتے ہیں اور حیات بعد الممات پر ایمان نہیں رکھتے وَقَالُوا مَا هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَا إِلَّا الدَّهْرُ (۴۵/۲۴) وہ کہتے ہیں کہ زندگی بس اسی دنیا کی زندگی ہے۔ اس میں ہم مرتے ہیں اور رہتے ہیں اور پھر مرورِ زمانہ کے ہاتھوں ہم ہلاک (فنا) ہو جاتے ہیں۔ یہاں بھی دہر سے کوئی فلسفیانہ تصور مراد نہیں ہے۔ بلکہ مرورِ وقت (Passage of Time) مراد ہے۔ لہٰذا زیر نظر باب میں علامہ اقبال نے جو کچھ کہا ہے وہ ان کے اپنے تصوف آمیز فلسفیانہ تصورات ہیں۔

زیر نظر باب کے پہلے دو شعر یہ ہیں۔

سبزہ بادا خاکِ پاکِ شافعی — عالمے سرخوش ز تاکِ شافعی

فکرِ او کوکبے ز گردوں چیدہ است — سیفِ برآں رفت را نامیدہ است

ہمسان امام شافعیؒ کی قبر پر شبنم افشانی کرے اور سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے۔ ان کی فکر کے تاکستان کی شراب سے ایک دنیا سرمست ہے۔ وہ فکر کہ جس نے آسمان سے تارے چنے ہیں۔ یعنی اس نے اس بلند و بالا فکر کو بیان کیا ہے کہ وقت ایک تیز شمشیر ہے۔

من چہ گویم ترا ایں شمشیر چیست
آب او سرمایہ دار از زندگیست

میں کیا بتاؤں کہ اس شمشیر کی ماہیت کیا ہے۔ بس اتنا سمجھ لیجئے کہ فولاد کی تلوار کی دھار میں تو موت پوشیدہ ہوتی ہے وہ جسے کاٹتی ہے اس کی زندگی ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن وقت وہ تلوار ہے جس کی دھار میں زندگی مضمر ہے۔ بلکہ یوں کہئے کہ اس کی دھار اور زندگی ایک ہی شے ہے۔

یہاں 'وقت' سے مراد وہ حقیقی زمان ہے جس میں ماضی حال اور مستقبل کا امتیاز نہیں ہوتا۔

صاحبش بالاتر از امید و بیم
دستِ او بیضا تر از دستِ کلیم

جو شخص اس حقیقی زمان (وقت) کا مالک بن جائے وہ طبعی زندگی کے حوادث سے ماورا اور خوف اور امید کی کشمکش سے بالاتر ہو جاتا ہے۔ اس کا ہاتھ حضرت موسےٰ کے ہاتھ سے بھی زیادہ مافوق الفطرت قوتوں کا مالک بن جاتا ہے۔ اس سے خارقِ عادت کرامات سرزد ہونی شروع ہو جاتی ہیں۔

سنگ از یک ضربت او تر شود
بحر از محرومیٔ نم بر شود

وہ جس پتھر پر عصا مارے اس میں سے چشمے بہنے لگ جاتے ہیں۔ اور اگر اس عصا کی زد سمندر پر پڑ جائے تو اس کا سارا پانی خشک ہو جاتا ہے۔

یہ سب زورِ خودی کی شاعرانہ تمثیلات ہیں جنہیں حقیقت پر محمول نہیں کرنا چاہیئے۔

در کفِ موسےٰ ہمیں شمشیر بود
کارِ او بالاتر از تدبیر بود

(حضرت) موسےٰ کے ہاتھ میں یہی شمشیر تھی جس سے ان کے پروگرام میں ایسی قوت پیدا ہو گئی تھی کہ فرعون و ہامان کی تمام تدابیر اس کے مقابلہ میں ناکام رہ گئی تھیں۔

سینۂ دریائے احمر چاک کرد
قلزمے را خشک مثلِ خاک کرد

اس کے زور سے انہوں نے بحرِ احمر (Red Sea) کا سینہ چاک کر دیا تھا اور سمندر کو خشک بیابان میں تبدیل کر دیا تھا۔

پنجۂ حیدر کہ خیبر گیر بود
قوتِ او از ہمیں شمشیر بود

خودی کی یہی وہ قوت تھی جس سے حضرت علیؓ نے خیبر کے قلعہ کو فتح کر لیا تھا۔ ان کی قوت کا راز بھی "وقت کی اسی تلوار" میں تھا۔ اسے بھی شاعرانہ تمثیل پر محمول کرنا چاہیئے۔ اس لئے کہ ایک نبی جس مقام سے قوت حاصل کرتا ہے (اور اس کی قوت اس کی وحی ہوتی ہے) اُس مقام تک ایک غیر نبی کی رسائی کبھی نہیں ہو سکتی۔

گردشِ گردونِ گرداں دیدنی است
انقلابِ روز و شب فہمیدنی است

وقت (یا زمان) کا ایک مفہوم تو وہ ہے جو روز و شب کی گردش سے ہمارے سامنے آتا ہے یعنی (Serial Time) اگرچہ یہ زمان غیر حقیقی ہوتا ہے لیکن اس کا سمجھنا بھی ضروری ہے۔ کیونکہ اس سے ہماری طبعی دنیا کا حساب و شمار وابستہ ہے اور طبعی دنیا کے معاملات کا بست و کشاد انسان کے لئے ضروری ہے۔ لیکن

اے اسیرِ دوش و فردا در نگر
در دلِ خود عالمِ دیگر نگر

تو اس غیر حقیقی زمان کی زنجیروں میں الجھ کر نہ رہ جا۔ بلکہ اپنے ضمیر کی گہرائیوں میں ڈوب جا۔ وہاں پہنچ کر تجھے حقیقی زمان

کی ماہیت کا علم ہوگا۔ وہاں تیرے سامنے ایک اور دنیا بے نقاب ہوگی۔ وہی دنیا حقیقی ہے۔

یہاں فلسفہ سے آگے گذر کر تصوف کی وجدانی دنیا آگئی ہے۔ اس کے بعد ہے۔

در گِلِ خود تخمِ ظلمت کاشتی
وقت را مثلِ خطے پنداشتی

تم نے وقت کو (نیوٹن کی طرح) ایک سیدھا خط سمجھ لیا ہے جس پر دنوں، مہینوں وغیرہ کے نشانات اس طرح پڑے ہیں جس طرح گز پر گرہوں کے نشانات ہوتے ہیں۔ یہ نشانات محض حساب و شمار کی غرض سے لگادیئے جاتے ہیں۔ ورنہ فی الحقیقت ان کا وجود کچھ نہیں ہوتا۔ اسی طرح اگر تم روز و شب کے سلسلہ کو حقیقی زمان سمجھ لو تو یہ علم نہیں جہالت ہے۔ روشنی نہیں تاریکی ہے۔

باز با پیمانۂ لیل و نہار
فکرِ تو پیمود طولِ روزگار

پہلے تم نے "وقت" کو ایک خط (لکیر) تصور کر لیا۔ پھر اس خط پر دن اور رات کے نشانات لگا کر ان سے زمانے کا طول ماپنے لگ گئے۔ یہ تمہاری بہت بڑی بھول ہے۔ بھول ہی نہیں۔ یہ تو بت پرستی ہے۔

ساختی ایں رشتہ را زنارِ دوش
گشتۂ مثلِ بتاں باطل فروش

تو نے شب و روز کے اس غیر حقیقی زمان کو حقیقی سمجھ کر اپنے تصورات کو زنار پوش بنا لیا اور بتوں کی طرح باطل فروش بن گیا

کیمیا بودی و مشتِ گل شدی
سرِ حق زائیدی و باطل شدی

تو اپنی اصل کے اعتبار سے کیمیا تھا۔ لیکن زمان کے اس باطل تصور سے بالکل مٹی بن کر رہ گیا۔ اپنی خلقت کے لحاظ سے تو حق کا ایک راز تھا۔ لیکن ان اکتسابی عقائد سے یکسر باطل بن گیا۔

مسلمی؟ آزاد ایں زنار شو
شمعِ بزمِ ملتِ احرار شو

اگر تو سچے معنوں میں مسلمان ہے تو اس زنار کو توڑ کر الگ پھینک دے اور زمان کے حقیقی تصور سے آزاد انسانوں کی محفل کی شمع بن جا۔ حقیقی حریت، اصل زمان کے تصور سے حاصل ہوتی ہے۔

تو کہ از اصلِ زماں آگہ نۂ
از حیاتِ جاوداں آگہ نۂ

چونکہ تو حقیقی زماں کی ماہیت سے واقف نہیں۔ اس لئے تو یہ بھی نہیں جان سکتا کہ حیاتِ جاوداں کسے کہتے ہیں اور وہ کیسے حاصل ہو سکتی ہے۔

تا کجا در روز و شب باشی اسیر
رمزِ وقت از لی مع اللہ یاد گیر

ایک روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ لِی مَعَ اللّٰہِ وَقْتٌ لَا یَسَعُنِیْ فِیْہِ نَبِیٌّ مُرْسَلٌ وَلَا مَلَکٌ مُقَرَّبٌ۔ یعنی بعض اوقات مجھے ایسا قربِ خداوندی حاصل ہوتا ہے کہ اس میں نہ کوئی نبی اور رسول بار پا سکتا ہے اور نہ ہی کوئی بارگاہِ خداوندی کا مقرب فرشتہ۔

علامہ اقبالؒ کہتے ہیں کہ تو کب تک اس حلقۂ روز و شب۔ اس غیر حقیقی زمان کا اسیر رہے گا۔ تجھے چاہیئے کہ رسول اللہ کے اس ارشاد سے حقیقی زماں کا راز سمجھ لے اور اس مقام تک پہنچنے کی کوشش کرے۔

چونکہ اس روایت کو نبی اکرمؐ کے ارشاد گرامی کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ ضروری ہے کہ اس کا جائزہ لیا جائے ظاہر ہے کہ اس میں اگر لِی مَعَ اللّٰہِ وَقْتٌ سے مراد وہ وقت ہے جس میں حضورؐ پر نزولِ وحی ہوتا تھا۔ تو اس کیفیت میں تمام انبیائے کرامؑ اپنے اپنے وقت میں شریک تھے۔ اس لئے اس اعتبار سے یہ کہنا ٹھیک نہیں کہ اس کیفیت میں کوئی اور نبی و مرسل بار نہیں پا سکتا تھا۔ اور اگر اس سے مراد کوئی اور کیفیت ہے جس میں نبی اور رسول بھی بار نہیں پا سکتے تھے، تو قرآن سے اس قسم کی کسی کیفیت کی سند نہیں ملتی۔ نیز جو کیفیت ایسی ہو جس میں کوئی نبی اور رسول بھی شریک نہ ہو سکتا ہو، ہم (غیر نبی) اس کی ماہیت کو کس طرح سمجھ سکتے ہیں۔

ان تصریحات سے ظاہر ہے کہ یہ روایت صحیح نہیں۔ یہ ہمارے اُس دور کی وضع کردہ نظر آتی ہے جب مسلمانوں میں تصوف آ گیا تھا۔ اور اسے اپنی سند کے لئے اس قسم کے سہارے تراشنے پڑتے تھے۔ اس کے بعد ہے۔

ایں و آں پیداست از رفتارِ وقت
زندگی سرّیست از اسرارِ وقت

کائنات میں جس قدر حوادث ظہور پذیر ہوتے ہیں سب حقیقی وقت کی رفتار سے ہوتے ہیں۔ اور خود ہماری زندگی بھی اُس زماں کے بھیدوں میں سے ایک بھید ہے۔

جیسا کہ ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں، اس باب میں علامہ اقبالؒ نے ایک ایسی بحث چھیڑ دی ہے جو فلسفیانہ اور متصوفانہ ہے۔ اس سے بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہو جانے کا امکان ہے۔ مثلاً کہا جا سکتا ہے کہ اگر تمام حوادث وقت (Time) ہی سے پیدا ہوتے ہیں تو پھر کفار کا وہ قول صحیح ہے کہ مَا یُهْلِکُنَا اِلَّا الدَّهْرُ۔ ہمیں زمانہ (دہر) ہی مارتا ہے۔ ان مباحث کو اگر فلسفیانہ اجتماعات تک محدود رکھا جاتا تو بہتر تھا۔ مثنوی اسرار و رموز سے مقصود کچھ اور تھا۔

اس کے بعد ہے۔

اصل وقت از گردشِ خورشید نیست
وقت جاوید است و خور جاوید نیست

حقیقی زمان آفتاب کی گردش سے پیدا نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ آفتاب تو خود مخلوق ہے۔ قدیم نہیں۔ اور زمانِ حقیقی مخلوق نہیں قدیم ہے۔
یہاں پھر وہی مغالطہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر زمانِ حقیقی قدیم ہے تو یہ خدا ہی کا دوسرا نام ہوا۔ کیونکہ اگر یہ خدا سے الگ کچھ اور ہو تو پھر دو قدیم ماننے پڑیں گے۔ اور یہ تصور باطل ہے۔ بہر حال حقیقی زمان کا جو تصور اقبال نے دیا ہے وہ خدا ہی کی صفات کو لئے ہوئے ہے۔ اس لئے یہی کہا جانا زیادہ مناسب ہوگا کہ اس سے مراد خود ذاتِ خداوندی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ مسئلہ ہے ہی بہت مشکل۔ ہم جب بھی خدا کا تصور کریں گے (خواہ اسے کتنا ہی پیچھے کیوں نہ لے جائیں) تو اس وقت زمان (Time) کا تصور ساتھ ہی آجائے گا۔ اس لئے کہ ہم کسی موجود کو (یعنی جو Exist کرتا ہے) زمان (وقت) کے بغیر تصور ہی میں نہیں لا سکتے۔ اس اعتبار سے زمان کو قدیم ماننا پڑتا ہے اور چونکہ قدیم ایک سے زیادہ نہیں ہو سکتے اس لئے زمان اور خدا کو ایک تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ لیکن بجائے اس کے کہ ہم اس الجھن میں الجھیں، سیدھی طرح یہ کیوں نہ سمجھ لیں کہ یہ ہمارے محدود ذہن کی نارسائی ہے کہ ہم خدا کا تصور زمان سے خارج نہیں کر سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے خدا پر ایمان کا مطالبہ کیا ہے۔ اس کی ماہیت کو سمجھنے یا پہچاننے (معرفت) کا مطالبہ نہیں کیا۔ ھو الاول والاخر پر ہمارا ایمان ہے۔ لیکن ہم اسے سمجھ ہی نہیں سکتے کہ خدا کس طرح الاول ہے اور کس طرح الاخر۔ قرآن ازلیت و ابدیت خداوندی سے بحث نہیں کرتا۔
اس کے بعد ہے۔

عیش و غم۔ عاشور و ہم عید ست وقت
سرِ تابِ ماہ و خورشید است وقت

خوشی اور غم کی کیفیات اور ان کے پیدا کرنے کے موجبات (عید اور عاشورہ) سب زمانِ حقیقی کے مظاہر ہیں۔ چاند اور سورج کی روشنی بھی اسی کی رہینِ منت ہے۔

وقت را مثلِ مکاں گستردۂ
امتیازِ دوش و فردا کردۂ

تمہاری غلطی یہ ہے کہ تم نے زمان (Time) کو مکان (Space) کی طرح پھیلا ہوا تصور کر لیا۔ اور اس طرح دوش و فردا کا امتیاز پیدا ہو گیا۔ پھیلا ہوا زمان (وقت) تو طبعی وقت ہے۔ یہ غیر حقیقی ہے۔ اصل زمان پھیلا ہوا نہیں، بلکہ خود انسان کے ضمیر کی گہرائیوں میں مثل گہر آسودہ ہے۔ بلکہ برگساں کے الفاظ میں، یہ زمان اندرونی ذات میں ایک پہاڑ کی طرح ہوتا ہے۔ جس میں ماضی۔ حال۔ مستقبل سب ایک (Duration) میں موجود ہوتے ہیں۔ لیکن یہ (Duration) ساکن نہیں

بلکہ ہر آن متغیر ہوتا ہے۔ بہرحال یہ ہے اقبال کے نزدیک حقیقی زمان جس کے متعلق عام طور پر غلطی سے سمجھ لیا گیا وہ یہی طبعی زمان ہے۔

اے چو بُو رَم کردہ از بُستانِ خویش
ساختی از دستِ خود زندانِ خویش

اس غلطی کا نتیجہ یہ ہوا کہ تم نے اپنے ہاتھوں اپنا قید خانہ تیار کر لیا۔ اور اس میں محبوس ہو کر بیٹھ گئے۔ اور اس طرح اپنے گلستانِ ذات سے یوں باہر نکل گئے جس طرح خوشبو پھول سے نکل کر پریشان ہو جاتی ہے۔

وقتِ ما کو اول و آخر ندید
از خیابانِ ضمیرِ ما دمید

وہ زمان جس کی نہ ابتدا ہے نہ انتہا۔ ہمارے ضمیر کی گہرائیوں سے ابھرتا ہے۔

زندہ از عرفانِ اصلش زندہ تر
ہستیٔ او از سحر تابندہ تر

جو اس حقیقی زمان کی اصل کو پہچان لیتا ہے، جو اس کی معرفت حاصل کر لیتا ہے۔ وہ اگر زندہ ہے تو زندہ تر ہو جاتا ہے اور اسکی ہستی نورانی صبح سے بھی زیادہ تابناک ہو جاتی ہے۔

زندگی از دہر و دہر از زندگی است
لاتسبوا الدھر فرمانِ نبیؐ است

اصل یہ ہے کہ زندگی اور دہر ایک ہی حقیقت کے دو رخ ہیں دہر زندگی ہے اور زندگی دہر ہے۔

علامہ اقبال نے یہاں دہر کا لفظ زمانِ حقیقی کے معنوں میں استعمال کیا ہے جسے وہ خود خدا قرار دیتے ہیں (حالانکہ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے قرآن میں دہر کا لفظ طبعی زمان کے معنوں میں استعمال ہوا ہے) اس پر وہ ایک حدیث سے سند لاتے ہیں جس میں کہا گیا ہے کہ لاتسبوا الدھر فان اللہ ھو الدھر۔ دہر کو گالی نہ دو۔ اسلئے کہ خدا ہی دہر ہے یہ حدیث بھی بتا رہی ہے کہ یہ اس زمانے میں وضع ہوئی جب مسلمانوں میں اس قسم کے تصوف آمیز فلسفہ کی بحثیں شروع ہو گئیں۔ ورنہ نبی اکرمؐ کے عہدِ مبارک میں اس قسم کی بحثیں کہاں تھیں۔ اگر ہوتیں بھی تو حضورؐ ان بحثوں میں پڑتے ہی کیسے جب کہ قرآن ان بحثوں سے خاموش ہے؟ قرآن نے زندگی کا ایک ضابطہ دیا تھا جسے نبی اکرمؐ نے اپنی عدیم النظیر تعلیم اور بے مثال عمل سے ایک درخشندہ و تابناک معاشرہ کے پیکر میں متشکل کر کے دکھا دیا۔ یہی قرآن کا مقصود اور یہی حضورؐ کا فریضۂ رسالت تھا۔

بلبل چہ گفت و گل چہ شنید و صبا چہ کرد   اکنوں کرا دماغ کہ پرسد ز باغباں

بہرحال جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے یہ فلسفیانہ بحثیں فنی حیثیت رکھتی ہیں اور ان کا مطالعہ بطور فن ہی کے کرنا چاہیئے ان سے البتہ یہ کام لیا جا سکتا ہے کہ جو غیر مسلم مفکر قرآنی حقائق کو اپنے فکر کی سطح پر سمجھنا چاہیں۔ انھیں یہ حقائق ان کی زبان میں سمجھائے جا سکتے ہیں۔ علامہ اقبال کے نزدیک ان مباحث سے یہی مقصود تھا۔ جہاں تک عوام کا تعلق ہے دین، ان مباحث کے بغیر بھی سمجھا جا سکتا ہے۔

اس باب کا باقی حصہ اگلی نشست میں پیش کیا جائے گا۔

اسلام کی سرگزشت

(مسلسل)

باب پنجم

علمی حرکت

علمی حرکت اور اس کے مراکز کا بیان

فصل اوّل

علمی حرکت کا اجمالی بیان

علمی حرکت کا لفظ ہم یہاں وسیع ترین معنوں میں استعمال کر رہے ہیں۔ اس سے ہماری مراد ہر وہ طرز فکر ہے جس کے مسلمانوں نے کسی حد تک منظم طور پر کوشش کی۔ چاہے اس کا تعلق تشریع سے ہو یا تفسیر و حدیث اور تاریخ و سیر وغیرہ سے۔ ہم اس میں سے صرف عقائد دینیہ کی حرکت کو مستثنیٰ کرتے ہیں جسے ہم ایک الگ باب میں بیان کریں گے۔ نیز لٹریری حرکت کو بھی جس پر ہم ایک مستقل جلد لکھیں گے۔

اب ہم اس علمی حرکت پر ایک سرسری نظر ڈالنا چاہتے ہیں جو اسلام کے ابتدائی عہد سے دولت امویہ کے سقوط تک عالم اسلام پر چھائی رہی۔

اُمیّت ہم زمانۂ جاہلیت میں عربوں کو اس حال میں دیکھ چکے ہیں کہ ان کے ہاں نہ علم تھا نہ فلسفہ۔ ان میں بجز چند مستثنیات کے ایسے آدمیوں کا قحط تھا جنھیں صحیح معنوں میں عالم کہا جا سکے۔ مختصراً یہ کہ عالم کا لفظ زیادہ سے زیادہ ایسے لوگوں پر بولا جاتا تھا جیسا کہ ہم نے حارث بن کلدہ اور نضر بن الحارث کے متعلق اس سے پہلے معلومات بہم پہنچائی ہیں۔

جہالت ان میں عام اور امیت ان کا شیوہ تھی ـــــ خصوصیت کے ساتھ دیہاتی اور بدوی اطراف میں ـــــ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ لکھنا پڑھنا اور علم زیادہ تر وہاں پروان چڑھتے ہیں جہاں آبادیاں زیادہ ہوں۔ ابن خلدون کا بیان ہے کہ اہل حجاز نے لکھنا پڑھنا اہل حیرہ سے سیکھا تھا اور خود انھوں حمیر والوں سے۔

یہ بات صحیح ہو یا غلط ہو بہرحال حجاز کے لوگوں اور مضری قبیلوں میں زیادہ تر سخت قسم کی بدویت اور شدید قسم کی جہالت پائی جاتی تھی۔ بلاذری نے اپنی کتاب فتوح البلدان میں نقل کیا ہے کہ اسلام کے ابتدائی عہد میں سارے قریش میں صرف سترہ آدمی لکھنا پڑھنا جانتے تھے[1]۔ ان کے نام یہ ہیں۔ عمر بن الخطاب۔ علی ابن ابی طالب۔ عثمان بن عفان۔ ابوعبیدہ ابن الجراح۔ طلحہ۔ یزید بن ابی سفیان۔ ابوحذیفہ ابن عتبہ ابن ربیعہ۔ حاطب بن عمرو۔ ابوسلمہ بن عبدالاسد مخزومی۔ ابان بن سعید ابن العاص ابن امیہ۔ ان کے بھائی خالد بن سعید۔ عبداللہ بن سعد بن ابی سرح عامری۔ حویطب ابن عبدالعزیٰ عامری۔ ابوسفیان بن حرب۔ معاویہ بن ابی سفیان۔ جہیم بن الصلت۔ اور قریش کے حلیفوں میں سے علاء بن الحضرمی[2]۔ ان کی عورتوں میں بہت تھوڑی سی تھیں جو لکھنا پڑھنا جانتی تھیں۔ مثلاً نبی اکرم صلعم کے اپنے گھرانے میں حضرت حفصہ اور ام کلثوم۔ اور دوسری عورتوں میں سے شفاء بنت عبداللہ عدویہ کا نام لیا جاتا تھا۔ ام المومنین حضرت عائشہؓ قرآن شریف پڑھ سکتی تھیں مگر انہیں لکھنا نہ آتا تھا[3]۔ یہی حال حضرت ام سلمہؓ کا تھا۔ تو جب قریش میں ——— جس کا حال ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ وہ تجارتی کاروبار میں سارے حجاز میں سب سے آگے آگے تھے ——— سترہ لکھنے پڑھنے والوں سے زیادہ نہیں تھے۔ تو ظاہر ہے کہ مضر کے دوسرے قبیلوں میں لکھے پڑھے لوگوں کا اور بھی قحط ہوگا۔ بلاذری ہی کا بیان ہے کہ اوس اور خزرج میں عربی میں لکھنا پڑھنا بہت ہی کم تھا۔ کچھ یہودی عربی میں لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ اور ابتدائی عہد میں مدینہ میں بچوں کو پڑھایا کرتے تھے۔ اسلام آیا تو اوس و خزرج میں چند لکھنے پڑھنے والے پائے جاتے تھے۔ بلاذری نے ان کے نام بھی گنا دیئے ہیں۔ یہ کل گیارہ آدمی تھے[4]۔ لکھنا پڑھنا ان کے ہاں چونکہ بہت ہی کم تھا۔ اسلئے جس آدمی کو لکھنا۔ تیراندازی کرنا اور تیرنا آتا تھا اسے "کامل" کے لقب سے پکارا جاتا تھا۔ چنانچہ سعد بن عبادہ اُسید بن حُضیر اور عبداللہ بن اُبی اس لقب سے ملقب کئے جاتے تھے[5]۔ اس سے پہلے ہم دیکھ چکے ہیں کہ زمانہ جاہلیت میں سوید بن الصامت کو بھی اسی لقب سے پکارا جاتا تھا۔

اسلام آیا تو رسول اللہ صلعم نے ان لوگوں میں سے جنہیں لکھنا پڑھنا آتا تھا۔ بعض سے قرآن کریم کی وحی کو لکھوانے کا کام لیا چنانچہ جب آپ مدینہ تشریف لائے تو ابتدائی دور میں اُبی بن کعب انصاریؓ قرآن کو لکھتے تھے۔ اگر اُبی بن کعبؓ موجود نہ ہوتے تو آپ زید بن ثابت انصاریؓ کو بلا لیا کرتے تھے اور یہ قرآن لکھتے تھے۔ اُبی اور زید ہی آپ کے سامنے وحی کو لکھتے اور جن لوگوں سے خط و کتابت ہوتی تھی ان کو خطوط لکھتے نیز معاہدات تحریر فرماتے تھے۔ قریش میں سے جس شخص نے ابتداءً رسول اکرم صلعم کے لئے لکھنے کی خدمت انجام دی وہ عبداللہ بن سعد بن ابی سرح تھا جو بعد میں مرتد ہوگیا تھا۔ اس کے بعد آپ کے لئے لکھنے کی خدمت عثمان بن عفانؓ۔ شرحبیل بن حسنہ، ابان بن سعید، خالد بن سعید، علاء بن الحضرمی۔ معاویہ ابن ابی سفیان انجام دیتے رہے۔ واقدی نے بیان کیا ہے کہ حنظلہ بن الربیع نے بھی ایک مرتبہ رسول اللہ صلعم کی پیشی میں لکھنے پڑھنے کا کام کیا ہے۔ اسی بنا پر لوگ ان کو حنظلہ الکاتب کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

---

(۱) فتوح البلدان طبع یورپ ص۴۷۱ ومابعد (۲) بحوالہ سابقہ (۳) ایضاً ص۴۷۳ (۴) ایضاً ص۴۷۴ (۵) بلاذری ص۴۷۳۔

یہ لوگ بھی جو وحی کو لکھتے تھے فن کتابت میں کچھ زیادہ ماہر نہیں تھے۔ اور نہ ہی ان کی کتابت کسی ایک طریقہ کی یا قوانین املاء کی پابند تھی۔ چنانچہ دیکھئے ان لوگوں نے لَاَاذْبَحَنَّہٗ ایک الف کی زیادتی کے ساتھ لکھا ہے۔ ایسے ہی لَاَاَوْضَعُوْا میں بھی ایک الف بڑھا دیا ہے بِاَیٖیْدٍ دو یاؤں کے ساتھ لکھا ہے نیز اِمْرَاَتَ فِرْعَوْنَ، اور قُرَّتَ عَیْنٍ لِّیْ وَلَکَ بھی تاء کے ساتھ لکھا ہے بعض موقعوں پر الف حذف کر دیئے ہیں اور بعض موقعوں پر دیئے ہیں۔ حالانکہ قانون املاء کی نظر میں یہ سب مواقع برابر تھے۔ اس کا سبب ـــــ جیسا کہ ابن خلدون نے بیان کیا ہے ـــــ لکھنے کے فن میں ان کی کمزوری اور یہ چیز تھی کہ وہ اس فن میں مہارت کے درجے تک نہیں پہنچے تھے۔

علمی حرکت میں اسلام کے اثرات

اسلام آیا تو اس نے علمی حرکت کو متعدد جہات سے فائدہ پہنچایا۔

(اول) دین کی نشر و اشاعت میں لکھنے پڑھنے والوں کی خاص طور پر ضرورت تھی۔ قرآن کی آیات لکھی جاتی تھیں جو لوگ پڑھنا جانتے تھے وہ ان لوگوں کو پڑھ پڑھ کر سناتے تھے جنہیں پڑھنا نہیں آتا تھا۔ حضرت عمرؓ کے اسلام لانے کے واقعہ میں آیا ہے کہ حضرت عمرؓ اپنی بہن اور بہنوئی کے پاس گئے تو ان کے ہاں اس وقت حضرت خباب بن الارت موجود تھے جن کے پاس ایک صحیفہ تھا اور اس میں سورۂ طٰہٰ لکھی ہوئی تھی جو وہ حضرت عمرؓ کی بہن کو پڑھا رہے تھے۔ لہذا طبعی بات تھی کہ رسول اللہ صلعم نے لوگوں کو لکھنے پڑھنے کی ترغیب دی تھی۔ چنانچہ غزوۂ بدر کے واقعہ میں مذکور ہے کہ بعض ان قیدیوں کا فدیہ جنہیں لکھنا پڑھنا آتا تھا، آپ نے یہ مقرر فرمایا تھا کہ وہ مدینہ کے بچوں میں سے کم از کم دس بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں۔ خود بعض مسلمانوں میں یہ احساس بیدار ہو رہا تھا کہ دین کی معرفت کامل طریقہ پر حاصل کرنے کے لئے انہیں لکھنا پڑھنا سیکھنے کی ضرورت ہے۔

حضور اکرم صلعم نے تو لوگوں کو اس کی بھی ترغیب دلائی کہ عربی زبان کے علاوہ وہ دوسری زبانوں کو بھی سیکھیں۔ کیونکہ ـــــ اسلام کے پھیل جانے کے بعد ـــــ شدت کے ساتھ اس کی ضرورت محسوس ہونے لگی تھی۔ بخاری میں زید ابن ثابتؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلعم مدینہ میں تشریف لائے تو مجھے آپؐ کی خدمت میں پیش کیا گیا اور بتایا گیا کہ یہ بچہ بنو نجار میں سے ہے اور اس نے قرآن کریم کی سترہ سورتیں پڑھ لی ہیں۔ چنانچہ وہ سورتیں میں نے آپ کو سنائیں اور آپ نے پسندیدگی کا اظہار فرمایا۔ آپ نے مجھے حکم دیا کہ میں یہودیوں کا طرز تحریر سیکھ لوں کیونکہ مجھے خطوط وغیرہ ان سے لکھوانے پر اطمینان نہیں ہے۔ چنانچہ میں نے یہودیوں کا طرز تحریر سیکھ لیا اور مجھے نصف ماہ گزرنے نہیں پایا تھا کہ میں خاصا لکھنے پڑھنے لگا تھا۔ چنانچہ یہودیوں کے نام آپ کے خطوط میں ہی لکھا کرتا تھا۔ نیز یہودیوں کے جو خطوط آتے تھے تو میں ہی انہیں پڑھ کر سنایا کرتا تھا۔ اسی طرح زید بن ثابت ہی کی ایک دوسری حدیث میں ہے کہ مجھ سے نبی اکرم صلعم نے ارشاد فرمایا کہ میں لوگوں کو خطوط لکھا کرتا ہوں مجھے اندیشہ ہے کہ لوگ اس میں کچھ کمی بیشی نہ کر دیں۔ لہذا تم سریانی زبان سیکھ لو۔ چنانچہ میں نے سترہ روز میں اس زبان کو بھی سیکھ لیا۔

جب مختلف ممالک فتح ہو گئے تو عربی عنصر ہی حاکم عنصر تھا جس کی وجہ سے ان کو ضرورت تھی کہ وہ علم حاصل کریں اور لکھنا پڑھنا سیکھیں۔ چنانچہ لکھنا پڑھنا برابر بڑھتا چلا گیا۔ خصوصیت کے ساتھ تابعین کے عہد میں اس میں کافی ترقی ہو چکی تھی۔

اسی طرح جو غیر عرب لوگ اسلام میں آئے دن داخل ہوتے تھے۔ وہ بھی اپنی دینی اور دنیاوی ضرورتوں کے لئے عربی سیکھنے پر مجبور تھے نہ صرف عربی سیکھنے پر بلکہ اپنی زبان کو درست رکھنے کیلئے انہیں عربی کی گرامر سیکھنے کی بھی ضرورت ہوتی تھی۔ جیسا کہ ہم اس سے پیشتر ابوعبیدہ سے نقل کر چکے ہیں۔

اس پر اتنا اضافہ اور کر لیجئے کہ فتوحات اسلامی کے بعد عربوں میں تمدن وحضارت نے نشوونما پانا شروع کر دیا تھا، چنانچہ حضرت عثمانؓ اور بعد کے خلفا کے عہد میں ــــ مکانات، محلات اور چونے اور گچ کی پختہ عمارات بنائی جانے لگیں تھیں ان کے دروازے ساگوان کی لکڑی سے بنائے جاتے تھے۔ اکثر صحابہ کے پاس بکثرت نقد اموال، باغات اور چشمے ہوتے تھے جیسے زبیر بن العوام، عبدالرحمٰن بن عوف سعد بن ابی وقاص اور مقداد وغیرہ۔ اس میں شک نہیں کیا جا سکتا کہ حضارت و تمدن کے ماتحت ہی فنی ترقیات ہوتی ہیں۔ اور لکھنا پڑھنا بھی بہرحال ایک فنی چیز ہی تو ہے۔

(دوم) علمی حرکت پر اسلام نے جو اثرات مرتب کئے ان میں سے ایک چیز یہ بھی تھی کہ اسلام نے عربوں میں وہ بیش قدر تعلیمات پھیلائیں جن کو ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ ان تعلیمات نے ان کے عقلی درجہ کو کافی بلند کر دیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ان میں دیگر اقوام و ملل کے احوال اور ان کی حسب ضرورت تفصیلی اور اجمالی تاریخ بھی پھیلا دی تھی۔ چنانچہ آدم، نوح، ابراہیم یوسف، موسیٰ، یونس، داؤد اور سلیمان علیہم السلام وغیرہ کے واقعات ان کے سامنے ایسے دلچسپ انداز میں پیش کئے گئے جس نے عربوں کے دلوں میں مزید معلومات حاصل کرنے کا ایک ہیجان پیدا کر دیا اور انہوں نے دوسری قوموں ــــ مثلاً یہود و نصاریٰ ــــ کے پاس سے وہ معلومات بہم پہنچائیں جو ان کے ہاں موجود تھیں۔ ان چیزوں میں تہذیب و ثقافت کا ایک مستقل عنصر تھا جس نے مسلمانوں کو فائدہ پہنچایا اور ان کے عقلی مدارک میں وسعت پیدا کر دی۔

اسلام نے نکاح، طلاق، مدنیت کے احوال و ظروف اور تعزیرات سے متعلق شرح و بسط سے احکام دیئے جو قانون بن گئے اور پھر انہوں نے مسلمانوں کے اجتماعی اور اقتصادی معیشت کے حالات کو ایک نظم کے ماتحت ڈھال دیا۔ اس قانون کو فقہا اور تشریعی علما نے اپنا سرچشمہ قرار دیا کہ وہ اس سے احکام کا استنباط کرتے اور پیش آمدہ نئے حوادث میں جنہیں ان کی جدید مدنیت پیدا کرتی جا رہی تھی انہی سے راہنمائی حاصل کرتے تھے۔ یہ چیز تشریعی حرکت کی ایک وسیع بنیاد بن گئی اسے ہم آگے چل کر بیان کریں گے۔ یہ تاثیرات ان لغوی اور لسانی "تاثیرات" پر اضافہ تھیں، جنہیں ہم ایک مستقل باب میں پیش کریں گے۔

(سوم) اسلام کی ایک دوسری چیز بھی تھی جس نے عربوں کی حیات عقلیہ پر بڑا ہی گہرا اثر چھوڑا ہے وہ یہ تھی کہ اس نے خدا اور اس کی صفات ــــ علم، قدرت، وحدانیت وغیرہ ــــ پر ایمان لانے کی طرف دعوت دینے میں ایسا مسلک اختیار کیا جو ان کی عقل کو بیدار کر سکے۔ یعنی اس نے یہ دعوت دی کہ وہ دنیا کے ظواہر پر غور و تدبر کریں۔ اَوَلَمْ يَنْظُرُوْا فِىْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَىْءٍ۔ کیا ان لوگوں نے آسمانوں اور زمین کے ملکوت اور ان چیزوں پر غور نہیں کیا جو خدا نے پیدا کی ہیں۔ فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ انسان کو غور کرنا چاہیئے کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا

ہے؛ فَلْيَنْظُرِ الْإِنْسَانُ إِلَىٰ طَعَامِهِ أَنَّا صَبَبْنَا الْمَاءَ صَبًّا ثُمَّ شَقَقْنَا الْأَرْضَ شَقًّا. فَأَنْبَتْنَا فِيهَا حَبًّا وَعِنَبًا وَقَضْبًا وَزَيْتُونًا وَنَخْلًا وَحَدَائِقَ غُلْبًا وَفَاكِهَةً وَأَبًّا مَتَاعًا لَكُمْ وَلِأَنْعَامِكُمْ. انسان کو اپنے کھانے کی چیزوں کی طرف ہی دیکھنا چاہیئے۔ ہم ہی تو ہیں جو پانی کو یوں موسلا دھار برساتے ہیں۔ پھر ہم ہی تو ہیں جو یوں زمین کو پھاڑ دیتے ہیں اور پھر اس میں اناج، انگور، ترکاریاں۔ زیتون، کھجوروں اور گھنے گھنے باغات، میوے اور چارہ کا گھاس اگاتے ہیں۔ جو تمہارے بھی کام آتا ہے اور تمہارے جانوروں کے لئے بھی۔ لَا الشَّمْسُ يَنْبَغِي لَهَا أَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ وَكُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ۔ نہ سورج کے لئے یہ بات مناسب ہے کہ وہ چاند سے مل جائے اور نہ رات ہی دن سے آگے نکل سکتی ہے۔ تمام کرے آسمان میں تیر رہے ہیں۔ إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَآيَاتٍ لِأُولِي الْأَلْبَابِ الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللّٰهَ قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلَىٰ جُنُوبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحَانَكَ بلاشبہ آسمانوں اور زمین کی خلقت اور دن رات کے اختلاف میں ان عقل والوں کے لئے بڑی نشانیاں ہیں جو اٹھتے بیٹھتے، اور اپنے پہلوؤں پر (لیٹتے) قانونِ خداوندی کو اپنی نگاہوں کے سامنے رکھتے اور آسمانوں اور زمین کی خلقت میں غور و فکر کرتے رہتے ہیں (تا آنکہ وہ بالآخر غور و فکر کر کے پکار اٹھتے ہیں کہ) اے ہمارے پروردگار! تو نے یہ سب کچھ یونہی بے نتیجہ پیدا نہیں کر دیا۔ تیری ذات اس سے کہیں بلند ہے ـــ وَمِنْ آيَاتِهِ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافُ أَلْسِنَتِكُمْ وَأَلْوَانِكُمْ اور آسمانوں اور زمین کی خلقت اور تمہاری زبانوں اور رنگوں کا اختلاف بھی خدا کی نشانیوں میں سے ہے ـــ غرضیکہ قرآن میں اس قسم کی بے شمار مثالیں ہیں۔

اس قسم کی آیات نے کائنات پر غور و فکر کرنے کی ترغیب دی اور عربوں کی حیاتِ عقلیہ کو نشو و نما دینے میں ان آیات نے نمایاں کام کیا۔

شاید یہی ـــ یعنی احوالِ کائنات پر غور و فکر تاکہ اس سے خدا اور اس کی صفات پر استدلال کیا جا سکے ـــ وہ چیز ہے جس کے لئے قرآن کریم حکمت کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے وَلَقَدْ آتَيْنَا لُقْمَانَ الْحِكْمَةَ اور ہم نے لقمان کو حکمت دی تھی۔ ہم جب لقمان کے ان اقوال کو پڑھتے ہیں جو قرآن کریم میں وارد ہوئے ہیں تو ان میں ہمیں اسی قسم کی چیزیں ملتی ہیں۔ قرآن میں ارشاد ہے يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَشَاءُ وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا اللہ جسے چاہتا ہے حکمت دیدیتا ہے اور جس شخص کو حکمت کی نعمت دیدی جاتی ہے اسے بیش قدر بھلائی دیدی جاتی ہے۔ نیز قرآن نے اس موقع اور مقام کا نام بھی حکمت رکھا ہے جس سے نصیحت حاصل کی جائے۔ وَلَقَدْ جَاءَهُمْ مِنَ الْأَنْبَاءِ مَا فِيهِ مُزْدَجَرٌ حِكْمَةٌ بَالِغَةٌ فَمَا تُغْنِ النُّذُرُ۔ اور بلاشبہ ان کے پاس ایسی خبریں آچکی ہیں جس میں ان کے لئے جھڑکنے کا کافی سامان ہے۔ وہ پوری پوری حکمت کی باتیں ہیں۔ پھر بھی (بدعملی اور انکار کے نتائج سے) ڈرانے والی چیزیں کوئی فائدہ

نہیں دے رہی ہیں ـــــ نیز خدا نے جو کچھ محمد صلعم پر وحی بھیجی تھی قرآن نے اس کا نام بھی حکمت ہی رکھا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔ ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰٓى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ..... الخ یہ اس وحی میں سے ہے جو تیرے نشوونما دینے والے نے تیری طرف بھیجی ہے یعنی حکمت میں سے ہے ـــــ امام مالکؒ سے پوچھا گیا کہ حکمت کس چیز کا نام ہے؟ امام مالکؒ نے جواب دیا دین کی معرفت، دین میں سمجھ اور اس کی پیروی کو حکمت کہتے ہیں[1]۔

یہی حال لفظ عِلْمٌ کا ہے۔ قرآن نے اس لفظ کو ان معانی میں استعمال نہیں کیا جن میں وہ بعد میں مستعمل ہونے لگا ہے جب تم یوں بولتے ہو علم النحو، یا علم الفقہ۔ یعنی وہ معنی جو انگریزی کے لفظ (SCIENCE) کے بالمقابل ہوتے ہیں۔ قرآن نے اس لفظ کو ـــــ جیسا کہ بظاہر نظر آتا ہے ـــــ معرفت کے وسیع ترین مفہوم میں استعمال کیا ہے وَفَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ ہر علم والے کے اوپر کوئی دوسرا علم والا ہے۔ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْۢ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْـًٔا اور تم میں سے کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو ارذل عمر تک لوٹا دیئے جاتے ہیں۔ تاکہ جو کچھ وہ جان چکے ہیں اس کے جاننے کے بعد وہ کوئی نئی چیز نہ جان سکیں۔

یہ لفظ ان معنوں میں دنیاوی تعارف پر بھی بولا جاتا ہے۔ چنانچہ خود قرآن کریم میں قارون کی زبان سے کہلوایا گیا ہے قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ۔ قارون نے کہا کہ یہ مال و متاع اس علم اور ہنرمندی کی وجہ سے مجھے دیا گیا ہے جو میرے پاس ہے۔ یعنی مال حاصل کرنے کے طریقوں کی معرفت اور پہچان (جو خالصتاً دنیوی چیز ہے) لیکن یہ لفظ زیادہ تر اس نوع کی معرفت ہی میں استعمال ہوتا ہے جس کا تعلق ہدایت اور راہ نمائی تک پہنچنے سے ہو۔ یعنی یہ وہ معرفت ہوتی ہے جو خدا کی میزان میں اپنا کچھ وزن رکھتی ہے۔ اس معنی میں یہ لفظ حکمت کے اس مفہوم سے قریب ہے جو ہم نے بیان کیا ہے۔ اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا خدا سے اسکے بندوں میں سے وہی لوگ ڈرتے ہیں جو علم رکھنے والے ہیں وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ عِلْمًا اور واقعہ یہ ہے کہ ہم نے داؤد اور سلیمان کو علم کی دولت سے نوازا۔ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِيْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ اور اگر اے پیغمبر اسلام! بالفرض تم نے اس کے بعد بھی کہ تمہارے پاس علم آچکا ہے ان کی خواہشات کا اتباع کیا تو تمہارے لئے خدا کے قانونِ مکافات سے بچانے والا کوئی کارساز یا مددگار نہیں ہو سکے گا۔

علمی حرکات اور اس میں مشہور حصہ لینے والوں کا بیان

صدر اسلام سے لے کر دولت امویہ کے آخر تک جب ہم علمی حرکات پر نظر ڈالتے ہیں تو وہ ہمیں تین جہتوں میں بٹی ہوئی ملتی ہیں۔ ایک تو دینی حرکت تھی۔ یعنی دینی مسائل، مثلاً تفسیر قرآن، حدیث، تشریع وغیرہ کی بحث۔ اور دوسرے تاریخی

---

[1] طبری نے حکمت کی تفسیر قول اور عمل میں درستی اور اصابت سے کی ہے۔

حرکت جس میں تاریخ، قصص، سیر وغیرہ چیزیں آجاتی ہیں۔ اور تیسرے فلسفی حرکت جس میں فلسفہ، منطق، کیمیا، اور طب وغیرہ علوم شامل ہیں۔ ہم نے پہلے بھی کہا تھا اور یہاں پھر دہراتے ہیں کہ اس دور کے متعلق جب ہم علمی حرکت کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو اس سے ہماری مراد منظم علوم نہیں جن کے فصول اور ابواب قائم کئے جا چکے ہوں کیونکہ یہ ایسی چیز ہے کہ اس عہد کا مسلمان اس تک پہنچ نہیں سکتا تھا، بلکہ علمی حرکت سے مراد وہ بیج ہے جس کے گرد بعد میں علوم کی تدوین و ترتیب ہو سکی۔ بہرحال اب ہم ان تینوں حرکتوں کو اجمالاً بیان کرتے ہیں۔

دینی حرکت یہ حرکت سب حرکتوں سے بڑی اور اپنے منطوق کے اعتبار سے سب سے زیادہ وسیع تھی۔ لوگ قرآن پر متوجہ ہوئے۔ اسکے معانی و مطالب کو سمجھنے کی کوششیں کیں اور اس کی آیات کی تفسیریں کیں۔ کچھ لوگوں نے قرآن کریم سے احکام کا استنباط کیا۔ بعینہٖ یہی کچھ حدیث میں بھی ہوا۔

یہ علمی حرکت رسول اللہ صلعم کی حیات طیبہ میں شروع ہو چکی تھی۔ آپ کے بعد اس میں وسعت پیدا ہوتی چلی گئی۔ آپ کے اصحاب کا اس میں نمایاں حصہ ہے۔

ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلعم کے اصحاب اپنے علمی درجات میں باہم بہت مختلف تھے جیسا کہ دیگر فضائل میں زیادہ تر مختلف تھے۔ بعض صحابہ دوسرے صحابہ سے زیادہ شجاع اور بہادر تھے۔ بعض صحابہ دوسروں کی بہ نسبت زیادہ سخی اور کریم تھے۔ ایسے ہی بعض صحابہ دوسرے صحابہ کی بہ نسبت زیادہ علمی بصیرت رکھتے تھے۔ حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "اس ہدایت اور علم کی مثال جسے دے کر خدا نے مجھے بھیجا ہے بارش کی طرح ہے جو کسی زمین پر برس رہی ہو۔ اس زمین کا کوئی ٹکڑا زرخیز ہوتا ہے جو پانی کو جذب کر لیتا ہے اور بے شمار چارہ اور گھاس پیدا کر دیتا ہے کوئی دوسرا ٹکڑا سخت ہوتا ہے وہ پانی کو محفوظ کر لیتا ہے جس سے خدا لوگوں کو نفع پہنچاتا ہے کہ لوگ اس سے پیتے، کھیتیاں کرتے اور باغوں میں آب پاشی کرتے ہیں۔ یہ بارش زمین کے ایک ایسے ٹکڑے پر بھی پڑتی ہے جو چٹیل میدان ہوتا ہے کہ نہ پانی کو محفوظ رکھتا ہے اور نہ ہی چارہ اور گھاس پیدا کرتا ہے۔ ...... الخ[1]

مسروق کہتے ہیں ــــ یہ تابعی ہیں ــــ کہ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کے ساتھ بیٹھا اٹھا کرتا ہوں۔ میں نے انھیں پانی کے گڑھے کی طرح پایا ہے۔ ایک گڑھا ایسا ہوتا ہے جو ایک آدمی کو سیراب کر سکتا ہے اور ایک گڑھا ایسا بھی ہوتا ہے جو دو آدمیوں کو سیراب کر سکتا ہے اور ایک گڑھا ایسا بھی ہوتا ہے جو دس آدمیوں کو سیراب کر دیتا ہے۔ اور ایک گڑھا ایسا بھی ہوتا ہے جو سو آدمیوں کو سیراب کر دیتا ہے اور ایک گڑھا ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ اگر سارے روئے زمین والے اس پر آ جائیں تو وہ ان سب کا پیٹ بھر دے[2]۔

---

[1] بخاری و مسلم۔ [2] طبقات ابن سعد صفحہ ۱۰۲ ج ۲

صحابہ میں سے چھ یا سات صحابی مشہور ہیں، جو علم کے طبقۂ اول میں شمار کئے جاتے ہیں۔ گننے والوں کا ان میں اختلاف بھی ہے۔ کوئی ایک کی جگہ کسی دوسرے کو شمار کر لیتا ہے۔ بہرحال وہ ہیں۔ حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت عبداللہ ابن عمرؓ، حضرت عبداللہ ابن عباسؓ، حضرت زید بن ثابتؓ اور حضرت عائشہؓ۔ یہ سارے کے سارے قریشی ہیں۔ بجز حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے کہ وہ ہذلی ہیں اور بجز زید بن ثابتؓ کے کہ وہ انصاری ہیں۔ مسروق کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلعم کے اصحاب کو اچھی طرح سونگھا ہے۔ میں نے تو ایسا پایا ہے کہ ان سب کا علم چھ آدمیوں پر ختم ہو گیا تھا اور وہ چھ آدمی یہ تھے۔ عمرؓ، علیؓ، عبداللہ بن مسعودؓ، معاذؓ ابوالدرداء اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہم۔ مسروق کہتے ہیں کہ اسکے بعد میں نے ان چھ صحابیوں کو اچھی طرح سونگھا تو میں نے ان سب کا علم حضرت علیؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ پر ختم پایا[1]۔ یزید بن عمیرہ سکسکی نے جو حضرت معاذ بن جبلؓ کے شاگرد تھے بیان کیا ہے کہ جب حضرت معاذؓ کا آخری وقت ہوا تو انھوں نے انھیں حکم دیا کہ ان چار صحابیوں سے علم حاصل کریں عبداللہ بن مسعودؓ عبداللہ بن سلامؓ سلمان فارسیؓ اور ابو درداءؓ۔ اس سے تم دیکھ سکتے ہو کہ ان لوگوں میں اس بارے میں کس قدر اختلاف تھا کہ صحابہ میں سب سے بڑا عالم کون ہے؟ اس بارے میں نظر کا اختلاف ایک طبعی امر ہے جو ہر زمانہ اور ہر قوم میں ہوتا ہے۔

بہرحال چند صحابہ ہیں جو علمی اعتبار سے طبقۂ اول میں شمار کئے جاتے ہیں اور بیس صحابہ ہیں جو طبقۂ دوم میں شمار کئے گئے۔ اور تقریباً ایک سو بیس طبقۂ سوم میں[2]۔ اگر ہم ان تمام صحابہ کے نام گنائیں اور ان کے نسب یہاں بیان کریں۔ تو بات طویل ہو جائے گی۔

---

[1] طبقات ابن سعد صفحہ ۱۱۰ ج ۲۔ [2] اصابہ صفحہ ۹ ج ۱۔

اسبابِ زوالِ اُمّت

(دوسرا ایڈیشن)

مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ میں پہلی مرتبہ بتایا گیا ہے کہ ہماری نکبت و زوال کے اسباب کیا ہیں؟ اور اس کا علاج کیا؟

ضخامت ۱۷۲ صفحات قیمت دو روپے

سب کی پسند
مسواک
ٹوتھ پیسٹ
MISWAK
Tooth Paste
MAKES TEETH PEARLY WHITE

DURA-GLOSS
Nail Polish
MADE IN U.S.A.
دُوراجلوس
ناخون کی پالش
تزئین حُسن کے لئے
ناخون کی آرائش ضروری ہے
دُوراجلوس
خوش رنگ دیدہ زیب چمکدار اور
خوشبودار پالش ہے۔
امریکہ میں بنی ہوئی
ہر بڑے دوکاندار سے ملتی ہے

حقائق و عبر

غلامی کے خلاف جہاد

لندن کے ہفتہ وار اخبار "دی نیو اسٹیٹسمین اینڈ نیشن" کی ۱۶ فروری ۱۹۵۷ء کی اشاعت میں عنوان بالا کے ماتحت ایک مضمون شائع ہوا ہے جو (بالخصوص) ہمارے لئے عبرت انگیز بھی ہے اور حقیقت کشا بھی۔ اس کا رواں ترجمہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

"یورپ میں رواج ہے کہ لوگ سفر کو جاتے وقت اپنے پاس کوئی قیمتی زیور رکھ لیتے ہیں۔ تاکہ اگر دیارِ غیر میں کسی وجہ سے خرچ کی کمی واقع ہو جائے تو اس زیور کو بیچ کر کام چلا لیا جائے۔ مشرقی ممالک نے اسی رسم کو ذرا بدل کر اپنے ہاں رائج کر لیا ہے۔ وہاں جب کوئی دولت مند مسلمان حج کے لئے جاتا ہے تو اپنے ساتھ تین چار ملازم فالتو لے جاتا ہے۔ اگر راستے میں کہیں خرچ کی کمی پڑ جاتی ہے تو انہیں غلاموں کی حیثیت سے فروخت کر دیا جاتا ہے۔ اس قسم کے "سفری چیکوں" کی جنہیں یوں روپوں میں تبدیل کر لیا جاتا ہے سالانہ مجموعی تعداد کتنی ہوتی ہے۔ اس کے متعلق متعین طور پر کچھ کہنا مشکل ہے۔ البتہ اس کا اندازہ اس سے لگ سکتا ہے کہ فرانسیسی افریقہ اور سوڈان کی سرحد پر ایک قصبہ ہے جس کا نام ہے ABECHE ۔ ۱۹۵۴ء میں اس قصبہ میں سے اکیس ہزار نو سو سات (۲۱۹۰۷) مسلمان حج کے لئے گزرے۔ ان میں سے تادمِ تحریر صرف نو ہزار گیارہ (۹۰۱۱) واپس آئے ہیں۔ یہ اعداد و شمار فرانسیسی افسروں نے، حکومت کی منظوری کے بعد، سرکاری طور پر جمع کئے ہیں۔

غلامی کی روک تھام کے لئے ایک سوسائٹی قائم ہے جس کے ڈائرکٹر مسٹر گرینج ہیں۔ انھوں نے اپنے ایک انٹرویو میں بتایا کہ اگر اس تعداد میں سے (جو واپس نہیں لوٹے) ایسے افراد کو منہا کر دیا جائے جو موت یا بیماری کی وجہ سے ضائع ہو گئے ہوں۔ تو بھی اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ کم از کم دس ہزار افراد غلاموں کی حیثیت سے فروخت کئے گئے ہونگے۔ یہ تو صرف ایک راستے سے گزرنے والے حاجیوں کے متعلق ہے۔ مسٹر گرینج نے بتایا کہ افریقہ کے مسلمان کئی دوسرے راستوں سے بھی حج کے لئے جاتے ہیں۔ ان علاقوں میں اکثر ہوتا یہ ہے کہ لوگ مبلغوں کے لباس میں گھومتے رہتے ہیں۔ اور عوام سے کہتے ہیں کہ چلو۔ ہم تمہیں مفت حج کرا دیں گے۔ یہ سادہ لوح مسلمان اُن کے فریب میں آ کر ان کے ساتھ ہو لیتے ہیں۔ اور عرب پہنچنے پر سعودی حکومت کے کارندے انھیں یہ کہہ کر گرفتار کر لیتے ہیں کہ ملک میں خلافِ قانون داخل ہوئے ہیں۔ اس کے بعد انھیں سرکاری طور پر غلاموں کی تجارت کرنے والوں کے ہاتھ بیچ دیا جاتا ہے اور ان کی قیمت فروخت سرکاری خزانہ میں جمع ہو جاتی ہے۔ جس سوسائٹی کا ذکر

کیا گیا ہے' اس نے غلاموں کو مختلف انواع میں تقسیم کر رکھا ہے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ ان سب میں' عربوں کے غلام بدترین حالت میں ہوتے ہیں ان میں عورتوں کو لونڈیاں بنا لیا جاتا ہے اور مردوں کو خواجہ سرا۔ ان سب سے ہر قسم کی محنت و مزدوری کرائی جاتی ہے (لیکن اس کی اجرت کچھ نہیں دی جاتی۔ اس لئے کہ) یہ غلام اور ان کے بچے' سب ان آقاؤں کی ملکیت ہوتے ہیں۔ ان کے کوئی حقوق نہیں ہوتے۔ وہ سراسر ان کے رحم و کرم پر ہوتے ہیں۔ ان پر جس قدر ظلم ہوں' ان کی داد فریاد کہیں نہیں ہو سکتی۔ سعودی عرب۔ یمن اور عمان میں غلامی کو قانوناً جائز تسلیم کیا جاتا ہے۔

گذشتہ جنگِ عظیم سے عربی ممالک میں غلاموں کی تجارت کو بڑا فروغ حاصل ہوا ہے۔ لیگ آف نیشنز نے غلامی کی روک تھام کے لئے مختصر سے پیمانے پر جو تدابیر شروع کی تھیں ان کا از سرِ نو احیاء نہیں ہوا۔ اگر اقوام متحدہ (یو این) اس قسم کی کوئی کمیٹی قائم کرنا چاہے تو برطانیہ اس اقدام کی تائید نہیں کرے گا۔ اسلئے کہ کمیونسٹ بلاک' اس چیز کو ان کے خلاف پراپیگنڈہ کرنے کے لئے بطور حربہ استعمال کرے گا۔ یہی وجہ ہے کہ غلاموں کی جو تجارت بحیرہ قلزم کے راستے ہوتی ہے۔ برطانیہ کے محتسب اب اس کی اس طرح روک تھام نہیں کرتے جس طرح وہ پہلے کیا کرتے تھے۔

اب حالت یہ ہے کہ جونہی کوئی غلام بکنے کے لئے آتا ہے' عربوں کے متمول رؤسا جنہیں تیل کے چشموں نے مالا مال کر دیا ہے اسے بڑی گراں قیمت پر خریدنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ وہاں ایک جوان غلام کی قیمت قریب ڈیڑھ سو پونڈ ہوتی ہے اور ایک خوش شکل لونڈی کی قیمت قریب چار سو پونڈ۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس قیمت میں ایک امریکن موٹر کار بھی مل سکتی ہے لیکن وہاں کا قدامت پسند معاشرہ لونڈی کو موٹر کار پر ترجیح دیتا ہے۔ اس لئے کہ وہاں ایک رئیس کی پوزیشن کو اس کی لونڈیوں کی تعداد سے جانچا جاتا ہے۔ جن لوگوں نے اس صیغے میں تحقیقات کی ہیں ان کا اندازہ ہے کہ عربی ممالک کی آبادی کا قریب پانچ فیصد حصہ ایسے غلاموں پر مشتمل ہے جن کی عام شیئے مستعمل کی طرح' خرید و فروخت ہوتی رہتی ہے۔ لیکن یہ سرسری اندازہ ہے۔ اس لئے کہ ان ممالک میں مردم شماری کبھی نہیں ہوئی۔ تخمینہ یہ ہے کہ ان ممالک میں غلاموں کی تعداد پانچ اور دس لاکھ کے درمیان ہے۔ عرب ہی وہ ملک ہے جہاں ـــــ غلاموں کے آقاؤں کے علاوہ ـــــ غلاموں کے تاجروں کو تجارت کے لئے سرکاری طور پر لائسنس ملتا ہے۔ یہ تاجر اپنی تجارت کی تفاصیل کسی کو نہیں بتلاتے۔ بایں ہمہ' وہ سوسائٹی جس کا پہلے ذکر کیا گیا ہے' اس کی بابت بہت کچھ جانتی ہے۔ مثلاً ان کے ریکارڈ میں یہ اطلاع موجود ہے کہ

> ..... مقام سے ..... مقام تک غلاموں کی تجارت کا باقاعدہ راستہ ہے۔ اور فلاں فلاں تاجر بڑے نامور ہیں۔ ان کا طریق کار یہ ہے کہ گانے بجانے والوں اور دوسرے تماشہ دکھانے والوں کے ساتھ ساز باز رکھتے ہیں۔ وہ گاؤں کے باہر تماشہ کرتے ہیں جس میں لوگ جمع ہو جاتے ہیں۔ مختلف قبائل میں ایسے لوگ بطور کارندے رکھے ہوتے ہیں جو لڑکیوں کو اغوا کرتے ہیں۔ ان کی اجرت کے علاوہ قبیلے کے شیخ کو بھی فی راس ایک معینہ رقم دی جاتی ہے۔ یہ غلام منڈیوں میں

کھلے بندوں بکتے ہیں۔ مکہ کی گلیوں میں آپ دیکھیں گے کہ ایک ایک تاجر کے پیچھے چھ چھ سات سات غلام اور لونڈیاں مویشیوں کی طرح رسیوں میں باندھے ہوئے چلے جا رہے ہیں۔
قریب ڈیڑھ سال کا عرصہ ہوا کہ ..... جو شاہ سعود کا غلاموں کا سوداگر ہے، عراق میں دس سال کے لئے جیل بھیجا گیا تھا۔ جب اسے گرفتار کیا گیا تو اسکے قبضے سے پچاس نابالغ لڑکیاں برآمد ہوئی تھیں۔ (ابھی پچھلے دنوں) کا واقعہ ہے کہ بارہ بلوچی غلاموں نے بھاگنے کی کوشش کی تو انھیں قتل کر دیا گیا۔ ان میں تین، شاہ سعود کی ذاتی ملکیت تھے۔ انھیں شاہی چوراہے میں قتل کیا گیا۔

غلام بھی (دیگر حیوانات کی طرح) ضائع ہو جانے والی جنس ہے۔ لیکن غلاموں کے سوداگر اپنی جد وجہد سے ہمیشہ تازہ جنس منڈیوں میں لاتے رہتے ہیں جس سے یہ سلسلہ متواتر جاری رہتا ہے۔ ان میں کچھ غلام وہ ہوتے ہیں جنھیں حج کے بہانے لایا جاتا ہے۔ کچھ افریقہ کے ساحلی علاقوں کے حبشی باشندے ہوتے ہیں جنھیں اغوا کر لیا جاتا ہے۔ اور کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جنھیں آس پاس کے ملکوں کے چھوٹے چھوٹے گاؤں پر یورش کر کے پکڑ لیا جاتا ہے۔

(اس کے بعد اس مضمون میں کچھ اور ملکوں کا بھی ذکر ہے جہاں غلامی مختلف شکلوں میں رائج ہے۔ آخر میں یہ بتایا گیا ہے کہ انسداد غلامی کے سلسلہ میں مذکورہ صدر سوسائٹی کیا کچھ کر رہی ہے اور اسکے بعد اسکے عزائم کیا ہیں)

طلوع اسلام | اس میں شبہ نہیں کہ غلامی جس ملک اور جس قوم میں بھی ہو باعث ننگِ انسانیت ہے۔ لیکن مسلمان ممالک میں اس کا وجود اس لئے اور بھی زیادہ شرمناک ہے کہ اسکے متعلق کھلے بندوں کہا جاتا ہے کہ اسلامی شریعت اسے جائز قرار دیتی ہے۔ اور اس شرعی جواز کی آواز سے زیادہ بلند آہنگی سے حجاز کی مقدس وادیوں اور مکہ کی باشرف گلیوں سے ابھرتی ہے

اے محمدؐ گر قیامت را بر آری سر ز خاک
سر برآرد ایں قیامت درمیانِ خلق ہیں

پاکستان میں لونڈیاں | یہ حالت تو اس وقت کی ہے۔ اس کے بعد غلام اور لونڈیاں صرف یمن اور حجاز کے علاقوں تک ہی محدود نہیں رہیں گی۔ جب مملکتِ جمہوریہ اسلامیہ پاکستان میں ملا کے خود ساختہ "قوانینِ شریعت" نافذ ہوں گے تو یہاں بھی لونڈیاں کھلے بندوں بلا اور بکا کریں گی۔ اس لئے کہ یہاں کے علمبردارانِ شریعتِ حقہ، جو حکومت کی باگ ڈور اپنے صالح ہاتھوں میں لینا چاہتے ہیں، کے نزدیک جنگ میں گرفتار شدہ عورتوں کو لونڈیاں بنایا جا سکتا ہے۔ ان سے بلا نکاح اور بلا تعداد جنسی تمتع کیا جا سکتا ہے۔ اور استعمال کے بعد، جب جی چاہے انھیں فروخت بھی کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اس باب میں سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی، اپنی تفسیر تفہیم القرآن۔ جلد اول کے صفحات ۳۳۹-۴۰ پر لکھتے ہیں

جو عورتیں جنگ میں پکڑی ہوئی آئیں اور ان کے شوہر دارالحرب میں موجود ہوں وہ حرام نہیں ہیں کیونکہ دارالحرب سے دارالاسلام میں آنے کے بعد ان کے نکاح ٹوٹ گئے۔ ایسی عورتوں سے نکاح بھی کیا جا سکتا ہے اور جس کی ملکِ یمین میں وہ ہوں (یعنی جن کی وہ لونڈیاں ہوں۔ طلوع اسلام) وہ ان سے تمتع بھی کر سکتا ہے

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں۔

لونڈیوں سے تمتع کے معاملہ میں بہت سی غلط فہمیاں لوگوں کے ذہن میں ہیں۔ لہٰذا حسب ذیل مسائل کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے۔

(۱) جو عورتیں جنگ میں گرفتار ہوں ان کو پکڑتے ہی ہر سپاہی ان کے ساتھ مباشرت کر لینے کا مجاز نہیں ہے۔ بلکہ اسلامی قانون یہ ہے کہ ایسی عورتیں حکومت کے حوالے کر دی جائیں گی۔ حکومت کو اختیار ہے کہ چاہے ان کو رہا کر دے۔ چاہے ان سے فدیہ لے۔ چاہے ان کا تبادلہ ان مسلمان قیدیوں سے کرے جو دشمن کے ہاتھ میں ہوں۔ اور چاہے تو انھیں سپاہیوں میں تقسیم کر دے۔ [پہلی تین باتیں تو قرآن میں ہیں۔ اور یہ چوتھی صورت ان حضرات کی اپنی "شریعت" کا اضافہ ہے طلوع اسلام] ایک سپاہی صرف اس عورت ہی سے تمتع کرنے کا مجاز ہے جو حکومت کی طرف سے باقاعدہ اس کی ملک میں دی گئی ہو۔

(۲) جنگ میں پکڑی ہوئی عورتوں سے تمتع کے معاملہ میں یہ شرط نہیں ہے کہ وہ اہل کتاب ہی میں سے ہوں۔ ان کا مذہب خواہ کوئی ہو بہرحال جب وہ تقسیم کر دی جائیں گی تو جن کے حصہ میں وہ آئیں وہ ان سے تمتع کر سکتے ہیں (یعنی خواہ وہ مشرک عورتیں ہی کیوں نہ ہوں جن سے قرآن نکاح بھی حرام قرار دیتا ہے۔ طلوع اسلام)۔

(۳) جس طرح شریعت نے بیویوں کی تعداد پر چار کی پابندی لگائی ہے۔ اسی طرح لونڈیوں کی تعداد پر نہیں لگائی۔

(۴) ملکیت کے تمام دوسرے حقوق کی طرح وہ مالکانہ حقوق بھی قابلِ انتقال ہیں جو کسی شخص کو ازروئے قانون کسی اسیرِ جنگ پر حکومت نے عطا کئے ہوں۔ [" حقوق کے قابلِ انتقال ہونے کے معنی یہ ہیں کہ پہلا مالک جب جی چاہے اپنی لونڈی کو کسی دوسرے کی ملک میں دے سکتا ہے۔ طلوع اسلام]

(۵) حکومت کی طرف سے حقوق ملکیت کا باقاعدہ عطا کیا جانا ویسا ہی ایک قانونی فعل ہے جیسا نکاح ایک قانونی فعل ہے۔ لہٰذا کوئی معقول وجہ نہیں کہ جو شخص نکاح میں کسی قسم کی کراہت محسوس نہیں کرتا۔ وہ خواہ مخواہ لونڈیوں سے تمتع میں کراہت محسوس کرے۔ (تفہیم القرآن)

طلوع اسلام۔ اب اس پر بھی لوگ زمامِ حکومت ان صالحین کے ہاتھ میں نہ دیں تو ملک کی بدقسمتی!

نزولِ مسیحؑ

جماعتِ احمدیہ (لاہور) کے ماہنامہ اسلامک ریویو (لندن) نے اپنی دسمبر ۱۹۵۶ء کی اشاعت میں ایک کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

> جہاں تک حضرت عیسےٰ کی ذات کا تعلق ہے، مسلمانوں کے تمام مکاتبِ فکر یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ نوعِ انسانی کی نشاۃ ثانیہ کے خداوندی پروگرام کے سلسلہ میں انھیں (حضرت عیسےٰ کو) بڑا اہم مقام حاصل ہے۔ یہ نشاۃ ثانیہ اُن کی دوبارہ تشریف آوری پر منحصر ہے۔ البتہ بعض کے نزدیک ان کا یہ نزول اُسی جسم کے ساتھ ہوگا اور بعض کے نزدیک روحانی۔

جماعت احمدیہ کو اپنے لٹریچر میں، اپنے عقائد کی نشر و اشاعت کا پورا پورا حق حاصل ہے۔ لیکن اس سلسلہ میں کوئی ایسی بات کہنا جس سے اسلام، یا مسلمانوں کے کسی مکتبِ فکر کے متعلق غلط فہمی پیدا ہو مناسب نہیں ہے۔ مندرجہ صدر اقتباس میں انھوں نے یہ ظاہر کیا ہے کہ نزولِ حضرت عیسےٰ کا عقیدہ تمام مسلمانوں میں پایا جاتا ہے حالانکہ یہ حقیقت نہیں وہ مسلمان جو دین کی سند قرآن کریم سے لاتے ہیں نہ حضرت عیسیٰ کی تشریف آوری کا عقیدہ رکھتے ہیں نہ کسی مہدی یا مجدد کی آمد کا۔ اس لئے کہ قرآن اس قسم کے کسی عقیدہ کی تائید نہیں کرتا۔ یہ عقائد ختمِ نبوت کے تصور کے منافی ہیں

باقی رہا حضرت عیسیٰ کی روحانی آمد (یعنی مثیل مسیح کی آمد) کا عقیدہ سو اصل کے اعتبار سے یہ عقیدہ حقیقی مسیح کی آمد کے عقیدہ کے برابر ہی ہے لیکن ملت کے لئے باعثِ نقصان ہونے کی جہت سے یہ اُس سے زیادہ شدید ہے۔ اس لئے کہ حقیقی مسیحؑ کے آسمان سے نزول کی صورت میں کسی اور کے لئے مسیح بن جانے کا امکان نہیں رہتا۔ لیکن مثیل مسیح کی آمد کی صورت میں، جس کا جی چاہے ایسا دعویٰ کر دے۔ اور اس طرح ملت میں انتشار کا موجب بن جائے۔

یاد رکھیئے! خدا کی طرف سے جس نے آنا تھا وہ (نبی اکرمؐ کی ذاتِ اقدس کی شکل میں) آ گیا۔ حضورؐ کے بعد اب خدا سے براہِ راست علم حاصل کرنے والا اور کوئی نہیں آئے گا۔ خدا کی طرف سے حاصل کردہ علم قرآن کے اندر محفوظ ہے جو تمام نوعِ انسانی کے لئے آخری اور مکمل ضابطۂ ہدایت ہے۔ اس ضابطۂ ہدایت کے مطابق ایک عملی نظامِ معاشرہ کا قیام ملت کا فریضہ ہے۔ اس کے لئے امت کسی "آنے والے" کی محتاج نہیں۔ کسی اور نے آنا ہوتا تو نبوت کا خاتمہ نبی اکرمؐ پر نہ ہوتا۔

کیا ہم اسلامک ریویو سے اس کی توقع رکھیں کہ وہ اپنے ہاں اس کی تصریح کر دیں گے کہ اس باب میں قرآن کی رُو سے صحیح پوزیشن یہ ہے۔

ذکرِ الٰہی

"حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی مدظلہٗ" کی تقریر کا ایک اقتباس جو اخبار مدینہ (بجنور) کی ۹ مارچ ۱۹۵۷ء کی اشاعت میں شائع ہوئی۔

محترم بزرگو! اور بھائیو! اس وقت کی تقریر کے واسطے میرا کوئی وعدہ نہ تھا۔ مگر یہاں خلاف وعدہ کے حکم کیا گیا۔ وقت گذر چکا ہے ہم کو سفر بھی درپیش ہے۔ چند منٹ کے واسطے بہت مختصر اور سب سے زیادہ مفید بات عرض کروں گا۔ کہ قائے نامدار جناب رسول اللہ صلعم ارشاد فرماتے ہیں۔ ما عمل ابن آدم من عمل انجی لہ من عذاب اللہ من ذکر اللہ۔ آدم کے بیٹے کا کوئی عمل اس کو اللہ تعالےٰ کے عذاب سے اتنا نجات دلانے والا نہیں ہے جتنا اللہ تعالیٰ کا ذکر ہے۔

صحابہؓ نے عرض کیا کہ کیا جہاد سے بھی زیادہ نجات دلانے والا ہے؟ ظاہر ہے کہ جہاد میں راحت و آرام کو قربان کرنا پڑتا ہے اور اپنے تن دھڑ اور جان کی بازی لگانی پڑتی ہے اس وجہ سے صحابہ کو شک ہوا کہ ذکر سے اس قدر فائدہ نہ ہونا چاہیئے۔ جتنا غزوہ اور جہاد سے اس لئے کہ دشمن کا سامنا کرنے میں نہایت تکلیف ہوتی ہے اور بڑی مصیبت کا سامنا کرنا پڑتا ہے اس وجہ سے انھوں نے پوچھا کہ کیا جہاد سے بھی زیادہ اللہ تعالےٰ کا ذکر اس کے عذاب سے نجات دلاتا ہے۔ اللہ کے ذکر میں تو اتنی مشقتیں نہیں ہیں جتنی کہ جہاد میں۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگرچہ جہاد کرنے والا غازی خون میں لت پت ہو جائے اور اسکی تلوار لڑتے لڑتے ٹوٹ جائے اور اس کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں وہ شخص بھی اس قدر خدا کی خوشنودی حاصل کرنے والا نہیں جس قدر خدا کا ذکر کرنے والا افضل ہے۔ نہایت قوی روایت ہے امام مسلم ابوداؤد وغیرہ نے اس کو نقل کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالےٰ کے ذکر میں باوجود آسانیاں ہونے کے اور جہاد میں بڑی بڑی تکلیفوں کا سامنا ہونے کے اللہ تعالےٰ کو ذکر کس قدر پسند ہے اور اتنا پسند ہے کہ فرضوں کے بعد کوئی عبادت اتنی پسندیدہ نہیں ہے

اس کے بعد ارشاد ہے۔

"دوستو! تم اپنے اپنے جھونپڑے میں بیٹھے بیٹھے اللہ اللہ کرتے رہو اس کی توجہ تمہارے ساتھ رہیگی۔

پھر یہ حدیث بیان کرتے ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ کے استغفر اللہ کہنے کو ایک مجلس میں دو سو تک گنا ہے۔ دوسری حدیث میں ستر مرتبہ کا ذکر ہے۔

آپ نے دیکھا کہ مسلمان کو جہاد سے بے گانہ رکھنے کے لئے ہماری تاریخ میں کیا کچھ کیا گیا ہے؟ "اپنے جھونپڑے میں بیٹھے اللہ اللہ کرتے رہو۔ اس کا ثواب میدانِ جنگ میں جہاد سے بھی زیادہ ہے" یہی وہ حربہ تھا جس کے متعلق اقبالؔ نے ارمغانِ حجاز میں (ابلیس کی زبان سے) کہلوایا ہے کہ

مت رکھو ذکر و فکر صبحگاہی میں اسے
پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے

سمندر کے کنارے

کراچی کے قارئین طلوع اسلام میں سے ایک صاحب نے حسب ذیل دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے۔

میں علی الصبح سمندر کی طرف سیر کے لئے جایا کرتا ہوں۔ گذشتہ سوموار (یعنی شب برات کے دوسرے دن۔ ۱۸ مارچ) کی صبح کا ذکر ہے کہ میں نے دیکھا کہ نیٹو جیٹی Native Jetty کے قریب سڑک پر بہت سے لوگوں کا ہجوم ہے۔ مرد، عورتیں، بوڑھے، بچے۔ ان کے لباس سے اندازہ ہوتا تھا کہ ان میں اونچے درجے کے لوگ بھی ہیں (جو موٹروں پر آئے ہیں) اور نیچے درجے کے بھی۔ سڑک کے کنارے یہاں وہاں کچھ مولوی صاحبان کھڑے ہیں۔ ایک شخص آتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں کاغذ میں لپٹی ہوئی کوئی چیز ہے۔ مولوی صاحب اسے ایک کاغذ کا پرزہ دیتے ہیں۔ وہ اسے خود پڑھتا ہے۔ اور اگر وہ پڑھنا نہیں جانتا تو مولوی صاحب پڑھتے جاتے ہیں اور وہ ان الفاظ کو دہراتا جاتا ہے۔ جب اسے ختم کر لیتا ہے تو نہایت ادب و تعظیم کے ساتھ اس چیز کو سمندر میں پھینک دیتا ہے۔ سنا گیا کہ یہ عمل قریب آدھی رات سے جاری ہے۔ اور عورتوں، مردوں کا ایک تانتا بندھ رہا ہے۔

میں نے ایک صاحب سے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ اس نے بتایا کہ کاغذ پر درخواست لکھی ہوتی ہے جس میں اپنی اپنی حاجت کا بیان ہوتا ہے۔ کوئی اولاد مانگتا ہے، کوئی دولت، کوئی ملازمت کا طالب ہے کوئی کاروباری منافع کا۔ اس کاغذ میں حلوہ لپیٹا جاتا ہے اور اس دعا کے ساتھ جسے مولوی صاحب پڑھاتے ہیں، اس درخواست (مع حلوہ) کو سمندر میں ڈال دیا جاتا ہے۔ میں نے بھی ایک مولوی صاحب سے دعا کا پرزہ لیا۔ اس پر یہ چھپا ہوا تھا۔

یہ عبارت بوقت عریضہ ڈالنے کے پڑھی جائے۔

يَا حُسَيْنَ ابْنَ رُوحٍ سَلَامٌ عَلَيْكَ أَشْهَدُ أَنَّ وَفَاتَكَ فِي سَبِيلِ اللهِ وَأَنَّكَ حَيٌّ عِنْدَ اللهِ مَرْزُوقٌ وَقَدْ خَاطَبْتُكَ فِي حَيَاتِكَ الَّتِي لَكَ عِنْدَ اللهِ عَزَّ وَجَلَّ وَهٰذِهِ رُقْعَتِي وَحَاجَتِي إِلَى مَوْلَانَا صَاحِبِ الْعَصْرِ عَلَيْهِ السَّلَامُ فَسَلْهَا إِلَيْهِ أَنْتَ الثِّقَةُ الْأَمِينُ.

اس دعا کا ترجمہ یہ ہے۔

اے حسین ابن روح۔ آپ پر سلام ہو میں اس کی گواہی دیتا ہوں کہ آپ کی وفات اللہ کے راستہ میں ہوئی اور آپ زندہ ہیں۔ خدا کی طرف سے آپ کو رزق ملتا ہے۔ میں آپ کی اس زندگی (کو سامنے رکھتے ہوئے) جو آپ کو خدائے عزوجل کے حضور حاصل ہے، مخاطب کرتا ہوں۔ اور اس رقعہ اور اپنی حاجت کو بدیں غرض پیش کرتا ہوں کہ آپ اسے مولانا صاحب العصر علیہ السلام

تک پہنچا دیں۔ اسلئے کہ آپ ثقہ (قابلِ اعتماد) اور امین ہیں۔

اس دعا اور اُس واقعہ کے ساتھ حلوہ سمندر میں ڈالا جا رہا تھا۔ کچھ حلوہ باہر بھی رکھا تھا۔ اس پر اگر کی بتیاں جلا رکھی تھیں۔ سمندر میں حلوہ ڈالنے والے کو اس میں سے کچھ حلوہ بطور تبرک ملتا تھا۔

میں یہ نہیں پوچھ سکا کہ وہ کس فرقہ کے لوگ تھے۔

یہ ہے وہ آنکھوں دیکھی بات جس کا ذکر ان صاحب نے کیا۔ ہم نے ایسی تقریب کا ذکر پہلی مرتبہ سنا ہے۔ شاید قارئین طلوع اسلام میں سے کوئی صاحب بتا سکیں کہ یہ کونسا فرقہ ہے اور اس تقریب کی حقیقت کیا ہے؛ شب برات اور اس کی آتشبازی کے متعلق تو ہم جانتے ہیں کہ یہ برامکہ کی ایجاد ہے۔ لیکن اس (سمندر یا دریا سے متعلق) تقریب کی بابت ہمیں کچھ معلوم نہیں۔

ان المساجد للہ

آجکل (مارچ ۱۹۵۷ء) مغربی پاکستان کے اہل حدیث حضرات کے اخبارات میں اس قسم کی خبریں اکثر شائع ہوتی رہتی ہیں کہ فلاں مقام پر اہل حدیث کی مسجد پر بریلویوں نے قبضہ کر لیا۔ پھر اس مسجد کو اُن کے ہاتھوں سے چھڑانے کے لئے فلاں فلاں اقدام کیا گیا۔ اس کے بعد ان کی طرف سے اپیل کی جاتی ہے کہ بریلوی حضرات کو ان کے اس قسم کے ناجائز اقدامات سے روکنا چاہیئے۔ وغیرہ وغیرہ۔

جہاں تک کسی کی جائداد پر کسی دوسرے کے ناجائز طور پر قابض ہو جانے کا تعلق ہے، اس حرکت کو یقیناً کوئی بھی قابلِ ستائش قرار نہیں دے گا۔ ایک ایسے معاشرے میں جس کا قیام قانون کی بنا پر ہو۔ اس قسم کے تصرف بیجا کو یقیناً روکنا چاہیئے۔ لیکن ہم اہل حدیث (اور ان کے ساتھ باقی فرقوں کے مسلمانوں سے بھی) باادب دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ یہ جو کہا جاتا ہے اہل حدیث کی مسجد بریلویوں کی مسجد۔ دیوبندیوں کی مسجد۔ حنفیوں کی مسجد وغیرہ وغیرہ: تو کیا خدا اور رسول کے ہاں بھی اس کے لئے کوئی سند ملتی ہے؟

جہاں تک قرآن کا تعلق ہے اس نے فرقہ بندی کو بنصِ صریح شرک قرار دیا ہے۔ ولا تکونوا من المشرکین من الذین فرقوا دینھم وکانوا شیعا۔ کل حزب بما لدیھم فرحون (۳۰/۳۱-۳۲) اور رسول اللہؐ سے ارشاد ہے کہ فرقے بنانے والوں سے تمہارا کوئی تعلق نہیں۔ ان الذین فرقوا دینھم وکانوا شیعا لست منھم فی شیء (۶/۱۶۰)۔ لہٰذا جب فرقہ بندی شرک ہے تو ہر شے جو فرقہ سے منسوب ہو گی، وہ بھی شرک ہو گی۔ اس اعتبار سے سچے کو اہل حدیث کی مسجد، بریلویوں کی مسجد، اہل قرآن کی مسجد کے معنی کیا ہیں؟ قرآن نے تو صاف الفاظ میں کہا ہے کہ ان المساجد للہ فلا تدعوا مع اللہ احداً (۷۲/۱۸) ساجد صرف اللہ کے لئے ہیں۔ سو اللہ کے ساتھ کسی اور کو مت پکارو۔

جہاں تک عمل رسول اللہؐ کا تعلق ہے۔ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ بعض لوگوں نے فرقہ بندی کی ذہنیت کے ماتحت ایک مسجد بنائی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے اس اقدام کو کفر سے تعبیر کیا اور اس مسجد کو خدا اور رسول کے خلاف جنگ کرنے والوں کی پناہ گاہ قرار دیا۔ والذین اتخذوا مسجداً ضراراً وکفراً وتفریقاً بین المؤمنین وارصاداً لمن حارب

اللہ ورسولہ من قبل۔ (۹/۶۴) اور رسول اللہ کو حکم دیا کہ لا تقم فیہ ابدا (۹/۱۰۹) چنانچہ تاریخ بتاتی ہے کہ حضورؐ نے اس ارشاد خداوندی کے ماتحت اُس مسجد کو گرادیا (یا جلادیا) بہرحال یہ ایک حقیقت ہے کہ رسول اللہؐ کے زمانہ میں نہ کوئی مسجد اہل حدیث کی تھی۔ نہ بریلویوں کی۔ نہ حنفیوں کی۔ نہ دیوبندیوں کی۔ سب مسجدیں مسلمانوں کی تھیں اور ان میں اللہ کا نام لیا جاتا تھا۔ لہٰذا اہل حدیث کی یا بریلویوں کی مسجد وغیرہ کی سند نہ قرآن سے مل سکتی ہے نہ سنت رسول اللہؐ سے۔ یہی نہیں کہ وہاں سے اس کی تائید میں سند نہیں مل سکتی بلکہ وہاں سے تو پتہ چلتا ہے کہ اُس زمانہ میں ان باتوں کو شرک اور کفر سمجھا جاتا تھا۔ کیا یہ حضرات بتائینگے کہ ان کے پاس اس تفریق کی سند کیا ہے؟۔

اب آگے بڑھیئے۔ اگر کسی جگہ کے ہندو مسلمانوں کی مسجد پر قبضہ کرلیں تو اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنا اور اس سے آگے اور اقدامات کرنا نہ صرف جائز اور ضروری ہوں گے۔ اس لئے کہ کسی مذہب والے کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ دوسرے مذاہب کے معابد پر قبضہ کرلے۔ لیکن "اہل حدیث کی مسجد" پر بریلویوں یا "بریلویوں کی مسجد" پر اہل حدیث کے قبضہ کرلینے کے معنی کیا ہیں؟ مسجدیں نماز پڑھنے کے لئے بنائی جاتی ہیں۔ اگر "اہل حدیث کی مسجد" میں بریلوی آجائیں گے تو کیا وہ وہاں نماز پڑھنے کی بجائے شوجی کے بت کی پوجا شروع کردیں گے؟ اگر وہ بھی وہاں نماز ہی پڑھیں گے تو پھر اس میں کسی کو کیا اعتراض ہوسکتا ہے؟

آپ ذرا ان حضرات کے طرز عمل پر غور کیجئے جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اگر عمل متواتر یقینی اور دین میں حجت ہے تو مسلمانوں کے مختلف فرقوں کی نمازیں اس قدر فرق کیوں ہے؟ رسول اللہؐ نے تو مختلف طریقوں سے نماز نہیں پڑھی ہوگی۔ اس کے جواب میں ان میں سے بعض لوگ یہ کہدیتے ہیں کہ نہیں! رسول اللہؐ نے مختلف اوقات میں مختلف طریقوں سے نماز پڑھی تھی۔ اسلئے ہر متواتر طریقہ مسنون ہے۔ لیکن دوسرے حضرات یہ کہتے ہیں کہ نمازوں میں یہ فرق بالکل جزئی اور فروعی ہے جس کا اصل نماز پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

یہ تو ہے ان حضرات کا قول (جسے وہ مخالفین کے مقابل میں دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں) لیکن ان کا عمل یہ ہے کہ اگر اہل حدیث کی مسجد میں بریلوی طریق کی نماز پڑھی یا پڑھائی جائے، تو ان کے نزدیک یہ فرق ایسا ہی ہے جیسے مسلمانوں کی مسجد میں ہندو (مورتی کی) پوجا شروع کردیں! یہ ہے ان حضرات کے نزدیک ان فروعات کے فرق کی اہمیت جن کے متعلق یہ (دوسروں کے سامنے بات کرتے وقت) کہتے ہیں کہ انھیں کچھ اہمیت حاصل نہیں!۔

ہم ان حضرات کی خدمت میں عرض کریں گے کہ "حنفی اور اہل حدیث" کی مساجد کی تخصیص، اس دور کی پیداشدہ ہے جب رسول اللہؐ کا لایا ہوا دین اپنی اصلی شکل میں باقی نہیں رہا تھا۔ جب پھر وہی دین دوبارہ قائم ہوجائے گا تو اس وقت نہ کوئی مسجد اہل حدیث کی ہوگی نہ بریلویوں کی۔ بعینہٖ اُس طرح جس طرح رسول اللہؐ کے زمانہ میں نہ کوئی مسجد اہل حدیث کی تھی اور نہ بریلویوں (وغیرہ) کی۔ اور یہی وہ دین ہے جسے بدبختی سے ہماری فرقہ پرستی آنے دینا نہیں چاہتی۔

سو سال پہلے کا کشمیری مسلمان

ہندو کے راج میں کشمیری مسلمانوں پر جو مظالم ہوئے ہیں، ان کی حیثیت اب ماضی کی خبروں کی ہو گئی ہے۔ وہاں ان سے حیوانوں سے بھی بدتر سلوک ہوتا ہے اور ان میں سے جو موقعہ پاتا ہے بھاگ کر پاکستان میں پناہ لے لیتا ہے۔ لیکن یہ داستان نئی نہیں۔ جب سے وہاں ڈوگرا راج قائم ہوا مسلمانوں کا یہی حشر ہوتا چلا آ رہا ہے۔ چنانچہ آج سے سو سال پہلے ۱۹ مارچ ۱۸۵۷ء کے اخبار ٹائمز آف انڈیا میں ہمیں یہ خبر ملتی ہے۔

> اخبار لاہور کرانیکل کا مری کا نامہ نگار لکھتا ہے کہ مہاراجہ گلاب سنگھ کے ظلم و ستم سے تنگ آ کر لوگ کشمیر سے راولپنڈی، جہلم اور سیالکوٹ کی طرف بھاگے آ رہے ہیں۔ اگرچہ مہاراجہ نے سخت حکم دے رکھا ہے کہ کوئی شخص ریاست چھوڑ کر نہ جائے۔ مہاراجہ گلاب سنگھ کے لڑکوں اور موتی سنگھ کے درمیان سخت مناقشت ہے اور کہا جاتا ہے کہ مہاراجہ کی موت پر کشمیر میں فسادات رونما ہو جائیں گے۔ مہاراجہ گلاب سنگھ بیمار ہے اور حکیموں کے علاج کے لئے پنجاب بھیجا جا رہا ہے۔ اس کی حالت قدرے بہتر ہے لیکن ابھی وہ لکڑی کے سہارے چلتا ہے۔ ..... اس کے مظالم کا ایک پہلو خونگوار بھی ہے اور وہ یہ کہ اب سڑکوں پر کام کرانے کے لئے ہمیں قلی بکثرت مل رہے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ جب کسی تنگ نظر قوم کے ہاتھ حکومت آ جائے تو وہاں رعایا کا یہی حشر ہوا کرتا ہے۔ حکومت کرنے کے لئے بڑی وسعتِ قلب کی ضرورت ہوتی ہے۔

لیکن رعایا میں سے بھی اسی کا ایسا حشر ہوا کرتا ہے۔ جو کمزور ہو۔

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

انسانیت کی چیخیں

ہمارا دور جہاں علم و ہنر اور تمدن و تہذیب کے عروج کا دور ہے وہاں تباہی و بربادی اور وحشت و درندگی کے بھی اوجِ کمال کا دور ہے۔ گذشتہ جنگِ عظیم نے دنیا کو جو تباہیوں کے مناظر دکھائے تھے وہی کم ہولناک نہ تھے۔ لیکن اس کے بعد اس امن کے زمانہ میں، آئندہ جنگ کے لئے جو تیاریاں ہو رہی ہیں وہ اس سے ہزاروں گنا زیادہ وحشت انگیز ہیں۔ ہم آئے دن کسی نہ کسی نئے بم کی ایجاد کی خبریں سن لیتے ہیں جس کے متعلق دعوےٰ کیا جاتا ہے کہ وہ کسی ملک کی ساری کی ساری آبادی کو فنا کر دے گا۔ جب ان بموں کا ٹکراؤ میدانِ جنگ میں ہوگا، اس وقت انسانیت کا کیا حشر ہوگا اسے چھوڑیئے، ابھی جو ان کے (TESTS) ہو رہے ہیں۔ ان کے اثرات سے جو تباہیاں رونما ہو رہی ہیں ان کا

تصور دل ہلا دیتا ہے۔ ساری دنیا ان تباہیوں کے خیال سے کانپ رہی ہے لیکن انسانیت کی بے بسی دیکھئے کہ کوئی ان سفاکیوں اور ہولناکیوں کو روک نہیں سکتا۔ اسی بے بسی کا نتیجہ ہے کہ لوگ اپنی جانیں تک دے کر انھیں روکنے کی سوچ رہے ہیں۔ چنانچہ ۲۳ مارچ کے اخبارات میں اس ضمن میں دو خبریں درج ہیں۔ ایک خبر لندن کی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ خود برطانیہ کا ایک جوڑہ (میاں بیوی) ایک چھوٹی سی کشتی میں اُس سمندر کی طرف جا رہا ہے جہاں حکومتِ برطانیہ اپنے ایچ بم "کا ٹسٹ" کرنا چاہتی ہے اس (میاں بیوی) کے جوڑے نے کہا ہے کہ ہم وہاں اس لئے جا رہے ہیں کہ ان بموں سے انسانی صحت اور جسم پر جو اثرات مرتب ہوتے ہیں انھیں اپنے آپ پر سہیں اور جو کچھ بھی ہمارا حشر ہو اسے آکر دورِ حاضر کے مہذب و متمدن انسانوں کو دکھائیں۔ ممکن ہے اس سے ان کا پتھر کا سا دل پسیج جائے اور یہ ان انسانیت سوز حرکات سے باز آجائیں۔ ان میاں بیوی کے تین بچے ہیں جنہیں انھوں نے اپنی مذہبی جماعت کے سپرد کر دیا ہے کہ وہ ان کی نگہداشت کریں۔

دوسری خبر جاپان کی ہے۔ ان کی تجویز یہ ہے کہ خودکشی کرنے والے رضاکاروں کا ایک جہاز ٹسٹ کے مقام پر بھیجا جائے تاکہ وہ اپنی جانیں دے کر انسانیت کی آنکھیں آنسو لانے کی کوشش کریں اور اس طرح دنیا اس عذابِ الیم سے محفوظ رہ سکے۔

یہ تجاویز و تدابیر درحقیقت انسانیت کی چیخیں ہیں جو انتہائی بے بسی کے عالم میں موجودہ معاشرہ کی زہریلی فضا کو چیر کر آسمان کی طرف جانے کی کوشش کر رہی ہیں۔ جن رقیق القلب انسانوں کے دل میں یہ خیالات پیدا ہوتے ہیں ان کے جذبات ہزار واجب الاحترام سہی، لیکن اس مرض کا یہ علاج نہیں۔ انسان کی تاریخ اس پر شاہد ہے کہ مظلومیت کی ٹھنڈی سانسیں ظالم کا دل پگھلانے میں کبھی کامیاب نہیں ہوئیں۔ ظلم کی دراز دستیوں کو روکنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ عدل کا فولادی پنجہ اس کی کلائی مروڑ کر رکھ دے۔

دنیا میں جو صورتِ حالات اس وقت پیدا ہو رہی ہے۔ قرآن نے اس کا حل ایک ہی بتایا ہے۔ اور وہ یہ کہ مختلف قوموں کے امتیازات کو مٹا کر سطحِ ارض پر بسنے والے تمام انسانوں کو ایک قوم (امتِ واحدہ) قرار دیا جائے جن کا نظامِ زندگی بھی ایک ہو اور ضابطۂ حیات بھی ایک۔ جب تک یہ نہیں ہوتا دنیا میں امن قائم ہونے کی کوئی صورت پیدا نہیں ہو سکتی لیکن یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ انسان وحدتِ خالق۔ وحدتِ مخلوق اور وحدتِ قانون پر علیٰ وجہ البصیرت ایمان لے آئے۔ ایسا نظر آتا ہے کہ انسان اپنے عقلی تجارب کے ہولناک نتائج و عواقب سے تنگ آکر اس حل کو اختیار کرے گا ——— لیکن بعد از خرابیٔ بسیار۔ عقل کا طریق ہے ہی کچھ ایسا۔ اسے جنت تک پہنچنے کے لئے جہنم پر سے گذرنا پڑتا ہے۔ یہ تو صرف وحی کا تجویز کردہ راستہ ہے جس سے انسان ان خوفناک گھاٹیوں سے محفوظ رہتا ہوا منزلِ مقصود تک پہنچ جاتا ہے۔

نقد و نظر

چوں نہ دیدند حقیقت......

عیسائیت نے یورپ کو طریق خانقاہیت سکھایا جس سے ان کے ارباب بصیرت نے دیکھا کہ وہ نہ دین کے رہتے ہیں نہ دنیا کے۔ اس کا ردعمل تھا جو مادیت (Materialism) کی شکل میں رونما ہوا۔ اب اس مادیت پرستی نے (جو انسان کو حیوان بلکہ مشین بنا کر رکھ دیتی ہے) ان کے اعصاب کو اس قدر چور چور کر دیا ہے کہ وہ امن و سکون کے لئے پھر پناہیں ڈھونڈھ رہے ہیں۔ چونکہ وحی خالص ان کے سامنے ہے نہیں اس لئے انھیں پھر اسی تصوف (Mysticism) میں پناہ دکھائی دیتی ہے جس سے تنگ آ کر انھوں نے مادہ پرستی کا مسلک اختیار کیا تھا۔ چنانچہ اب کچھ عرصے سے وہاں ہو رہا ہے کہ ان کے بڑے بڑے سائنسداں (مثلاً ایڈنگٹن) نامور مفکر (مثلاً برگساں) خدا فراموش منطقی (مثلاً رسل وغیرہ) عمر بھر کی تگ و تاز کے بعد آخری ایام میں تصوف کی طرف آ جاتے ہیں۔ اور ممکنات کی دنیا کو چھوڑ کر جہانِ نامشہود کی طرف دعوت دیتے دیتے چل بستے ہیں۔ یہی مسلک اب (Aldous Huxley) اختیار کر رہا ہے۔ چنانچہ حال ہی میں اس کی دو آخری کتابیں ہمارے سامنے آئی ہیں۔ ان میں سے ایک کا نام ہے (The Doors Of Perception) آپ کو معلوم ہے کہ اس میں کیا لکھا ہے؟ سنئے۔

جنوبی امریکہ میں ایک جنگلی بوٹی ہوتی ہے جس کا نام ہے (MESCALIN) وہاں کے قدیم (وحشی) قبائل اس کی جڑ کو کھاتے ہیں جو بھنگ کی طرح بانشہ آور ہوتی ہے۔ اور نشے کے عالم میں عجیب و غریب باتیں کرتے ہیں۔ چنانچہ ہکسلے صاحب نے بھی اس "سبز پری" کا استعمال کیا اور نشے کے عالم میں جو کچھ دیکھا اور جو کچھ کہا وہ نہایت حزم و احتیاط سے ریکارڈ کیا گیا۔ انہی "وارداتِ افلاکی" کا مجموعہ زیرِ نظر تصنیف ہے۔ ہم نے ان ملفوظات کا نام "وارداتِ افلاکی" یونہی نہیں رکھ دیا۔ خود ہکسلے کا خیال ہے کہ اس طرح حواسِ ظاہر کے دروازے بند کر لینے سے انسان کی باطنی کھڑکیاں کھل جاتی ہیں اور ہر شے اپنے حقیقی رنگ میں (کما ہی) نظر آنے لگ جاتی ہے۔ اس کا حقیقی رنگ اس کے ظاہری پیکر سے بالکل مختلف معلوم ہوتا ہے۔

آپ نے دیکھا کہ یہ وہی باتیں ہیں جو ہمارے ہاں بھنگڑ خانوں میں ہوا کرتی ہیں اور جنھیں پھر مریدانِ باصفا "عجیب عجیب" معنی پہنا کر عالمِ لاہوت کے اسرار و غوامض کی شکل میں پیش کیا کرتے ہیں۔ ہکسلے کی دوسری کتاب (Heaven And Hell) اس سلسلہ کی اگلی کڑی ہے۔ اس میں انھوں نے بتایا ہے کہ قدیم زمانے کے صوفیوں اور یوگیوں کا طریق یہ تھا کہ

وہ مسلسل فاقوں اور جانکاہ مشقتوں سے اپنے اوپر کچھ کیفیات وارد کیا کرتے تھے جن سے ان پر باطن کے دروازے کھل جاتے تھے۔ کھلنے کی تحقیق یہ ہے کہ انسانی دماغ پر جو اثرات ان فاقوں اور ریاضتوں سے مرتب ہوتے ہیں۔ وہی اثرات چند ادویات کے ذریعہ پیدا کئے جا سکتے ہیں۔ چنانچہ ان کی تجویز یہ ہے کہ اب تصوف کے پرانے دقیانوسی طریق کو بدل کر اس کی جگہ نیا ادویاتی طریق اختیار کیا جائے۔ اس سے راستے آسان اور مسافتیں مختصر ہو جائیں گی اور لوگ "روحانیت" کی طرف پھر کشاں کشاں چلے آئیں گے۔

یہ ہے وہ مسلک جسے مغرب کا یہ ممتاز صاحب قلم اب اپنی عمر کے اس دور میں اختیار کر رہا ہے اور جسے "دنیائے حقائق" کہہ کر اہل ہوش کو اس کی طرف دعوت دے رہا ہے۔ سچ کہا تھا کہنے والے نے کہ

چوں نہ بیند حقیقت رہ افسانہ زند

اے کاش ان مجاذیب فرنگ کے سامنے کہیں قرآن آجاتا تو پھر علم و عقل اس طرح ذلیل تو نہ ہوتے!

قال۔ اقول

لاہور کی جماعت اہل حدیث کے ماہنامہ رحیق کی مارچ ۱۹۵۷ء کی اشاعت میں ایک کتاب پر تبصرہ شائع ہوا ہے جس سے ہم قارئین طلوع اسلام کو بھی متعارف کرانا چاہتے ہیں۔ یہ اہم تصنیف کتابی سائز کے پونے چھ سو صفحات پر مشتمل ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس قدر ضخیم کتاب میں زندگی یا دین کے کون سے اہم حقائق کو بے نقاب کیا گیا ہے! اس کے متعلق ہم سے نہیں تبصرہ نگار سے سنئے۔ جنہوں نے تبصرہ میں اپنی طرف سے کچھ نہیں لکھا بلکہ کتاب کا مقدمہ بطور تبصرہ شائع کر دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

> ہر نماز میں قراءۃ سورہ فاتحہ کی فرضیت پر علمائے حدیث نے قدیماً و حدیثاً بہت سی کتابیں تصنیف فرمائی ہیں۔ زیر نظر کتاب اپنی جامعیت اور نادر علمی مباحث کے باعث اس سلسلہ میں بہت اچھا اضافہ ہے۔

یعنی اس تصنیف میں اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے کہ نماز میں امام کے پیچھے مقتدیوں کے لئے سورۂ فاتحہ پڑھنا فرض ہے اور اس کی خصوصیت یہ ہے کہ

> اس میں ایک ایسی کتاب کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے جو پچھلے چند مہینوں میں بڑے بلند دعاوی کے ساتھ نمودار ہوئی تھی۔

یعنی احناف کی طرف سے کوئی کتاب شائع ہوئی جس میں کہا گیا تھا کہ امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ نہیں پڑھنی چاہیئے۔ اب اس کے جواب میں اہل حدیث حضرات کی طرف سے یہ کتاب شائع ہوئی ہے جس میں ان کے دعوے کا رد کیا گیا ہے۔

آپ نے غور فرمایا کہ ہمارے علمائے امت (وہ حنفی ہوں یا اہل حدیث) کن مہمات امور کے حل کرنے میں مصروف جہاد

ہیں اور یہ چیز کچھ اسی دور سے مخصوص نہیں۔ یہ حضرات صدیوں سے اسی قسم کے مسائل کے سلجھانے میں لگے ہوئے ہیں اور مطمئن ہیں کہ ہم دین کی عظیم خدمت سرانجام دے رہے ہیں۔ سوچئے کہ دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے اور ہم کہاں پھنسے ہوئے ہیں!

یارانِ تیز گام نے محمل کو جالیا ہم محوِ نالۂ جرسِ کارواں رہے

یہ حضرات صدیوں سے ان گتھیوں کو سلجھا رہے ہیں اور جس قدر سلجھانے کی کوشش کی جاتی ہے وہ اور الجھتی چلی جاتی ہیں۔ اس لئے کہ (اکبر کے الفاظ میں) یہ حضرات

ڈور کو سلجھا رہے ہیں اور سرا ملتا نہیں۔

اس الجھی ہوئی ڈور کا سرا یہ ہے کہ امت میں جو اختلافات پیدا ہو چکے ہیں ان کا دور کرنا افراد کے بس کی بات نہیں۔ انہیں دور کر سکتا ہے اسلامی نظام جو قرآن کی روشنی میں علیٰ منہاج نبوت قائم ہو۔ اس قسم کا نظام تو یہ حضرات قائم ہونے نہیں دیتے (بلکہ اس کی دعوت کی بھی سخت مخالفت کرتے رہتے ہیں) اور انفرادی طور پر اختلافی مسائل کے حل کرنے میں اپنی توانائیاں اور قوم کا روپیہ ضائع کئے جاتے ہیں۔ وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا (۱۸/۱۰۴)

قرآن کے متعلق ان حضرات کا مبلغ علم کیا ہوتا ہے، اس کا اندازہ اسی تبصرہ کے ایک اقتباس سے لگائیے جس میں لکھا ہے

> متحدہ ہندوستان میں آج سے تقریباً دو صدی قبل تک مذہبی اور علمی حلقوں کا اوڑھنا بچھونا فقہ حنفی کی درسی ذفتاوے کی کتابیں تھیں۔ اس وقت یہ غلط فہمی عام تھی کہ ان کتابوں کے مندرجات عین اسلام ہیں۔ اور ساری شریعت انہی میں منحصر ہے اس غلط فہمی کی وجہ عام طور پر کتاب اللہ اور حدیث رسول اللہ سے ناآشنائی تھی حدیث کی کتابیں خال خال اور محدود کسی کے پاس ہونگی۔ البتہ قرآن حکیم بے شک موجود تھا لیکن علماء کی اکثریت تک کو پتہ نہ تھا کہ اس کتاب مبارک میں ہے کیا؟ پتہ تھا بھی تو شاید یہی قدر جس قدر کتب اصول و فقہ حنفی میں ذکر آتا ہے کہ فلاں آیت سے شافعیہ کا استدلال یوں ہے اور ہم حنفیوں کی طرف سے اس کا یہ جواب۔ جعلوا لقرآن عضین۔

یہ ہے علم قرآنی کے متعلق وہ سارٹیفکٹ جو اہل حدیث حضرات کی طرف سے علمائے اہل فقہ کو عطا ہوا ہے۔ اس کے برعکس اگر آپ اہل فقہ حضرات سے پوچھئے تو وہ اسی قسم کا سارٹیفکٹ اہل حدیث حضرات کو دیدیں گے اور ایک حنفی واہل حدیث ہی پر کیا منحصر ہے، سب فرقے ایک دوسرے کے متعلق یہی کہتے ہیں کل حزب بما لدیھم فرحون کی قرآنی شہادت اس پر دال ہے۔ اہل حدیث حضرات کا احناف کے خلاف اعتراض یہ ہے کہ ثانی الذکر سمجھتے ہیں کہ

ان کی کتابوں کے مندرجات عین اسلام ہیں اور ساری شریعت انہی میں منحصر۔

ہم اہل حدیث حضرات سے باادب دریافت کرتے ہیں کہ کیا بعینہٖ آپ کا بھی یہی ایمان نہیں کہ

آپ کی کتابوں کے مندرجات عین اسلام ہیں اور ساری شریعت انہی میں منحصر۔

اور اگر آپ کا بھی یہی ایمان ہے تو پھر آپ دوسروں کو کس بات کا طعنہ دیتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ حضرات قرآن کا نام محض تبرکاً بیچ میں لے آئے ہیں۔ ورنہ ان کی شریعت میں قرآن بے چارہ کہیں آتا ہی نہیں۔ اگر قرآن بیچ میں آجائے تو سب سے پہلے ان کے فرقے ختم ہو جاتے ہیں۔ اس لئے کہ قرآن کی رو سے دین میں فرقوں کا وجود ہی شرک ہے۔

اصل یہ ہے کہ حنفی ہوں یا شافعی۔ اہل حدیث ہوں یا بریلوی۔ دیوبندی ہوں یا چکڑالوی۔ آج (اقبال کے الفاظ میں) امت کی مجموعی حالت یہ ہو چکی ہے کہ

تمدن تصوف شریعت کلام — بتانِ عجم کے پجاری تمام
حقیقت خرافات میں کھو گئی — یہ امت روایات میں کھو گئی
لبھاتا ہے دل کو کلامِ خطیب — مگر لذتِ شوق سے بے نصیب
بیاں اس کا منطق سے سلجھا ہوا — لغت کے بکھیڑوں سے الجھا ہوا
وہ صوفی کہ تھا خدمتِ حق میں مرد — محبت میں یکتا حمیت میں فرد
عجم کے خیالات میں کھو گیا — یہ سالک مقامات میں کھو گیا

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

اور یہ سب قرآن کو مہجور بنا دینے کا نتیجہ ہے۔

چن بس ویش ور کسی درخت سے اگر اکاس بیل کی ایک شاخ لپٹ جائے تو وہ درخت کبھی ہرا نہیں ہونے پاتا۔ جس درخت کو چاروں طرف سے اکاس بیل کی شاخیں لپٹ جائیں تو اس کا جو حشر ہوگا وہ ظاہر ہے اسلام کا درخت وہ ہے جس پر ہر طرف سے اکاس بیل کی شاخیں لپٹ رہی ہیں۔ ان میں آخری شاخ "قادیانی نبوت" کی سمجھی جاتی تھی لیکن اب ایک اور شاخ کا بھی انکشاف ہوا ہے۔

تقسیم ہند کے بعد سے آپ کو پاکستان کے مختلف شہروں (بالخصوص کراچی) میں، کچھ حضرات دکھائی دیتے ہوں گے۔ سبز عمامہ۔ لمبے لمبے بال۔ مبلغوں کا سا انداز۔ عقائد و مسلک کا پوچھئے تو کسی سے کچھ کہیں گے کسی سے کچھ۔ اپنے مشن کی بابت یہ بتائینگے

کہ ہم پاکستان کے مسلمانوں کو جہاد کے لئے تیار کر رہے ہیں تاکہ ہندوستان کو فتح کرلیا جائے۔ غرضیکہ یہ لوگ کچھ عجیب معمہ سا بن رہے تھے کہ حیدرآباد (دکن) کے پروفیسر الیاس برنی صاحب نے زیرِ نظر مختصر سے پمفلٹ میں ان کی نقاب کشائی کی ہے۔ پروفیسر برنی صاحب وہی بزرگ ہیں جنہوں نے قادیانی دجل و فریب کے طشت از بام کرنے میں (Specialise) کیا ہوا ہے اس پمفلٹ میں بھی انہوں نے شروع میں قادیانیت کے چہرے سے پردہ اٹھایا ہے۔ اور اس کے بعد یہ بتایا ہے کہ حیدرآباد (دکن) کے صدیق دیندار (عرف چن بس ویشیشور) صاحب کس طرح شروع میں قادیانی تحریک کے مبلغ رہے اور اس کے بعد اپنے مستقل ظہور کا دعوٰے کر دیا۔ یہ ظہور "یوسف موعود" کی شکل میں ہوا ہے۔ یہ عمامہ پوش حضرات انہی چن بس ویشیشور صاحب کے مرید تھے جن کا دعوٰے یہ تھا کہ

> ان کی صحبت سے کئی مثیلِ انبیاء بنے اور بن رہے ہیں۔ جو خانقاہ میں زندگی وقف کرکے بیٹھتا ہے وہ مریم بن جاتا ہے۔ جب وہ میدان میں نکلتا ہے تو مسیح بن جاتا ہے اس طرح مُردوں کو زندہ کرنے والے ہماری خانقاہ سے نکل رہے ہیں۔ جن کو اللہ نے یحیٰی۔ نوح اور موسٰے پکارا وہ بھی میرے بیعت کردہ ہیں۔
>
> (دعوۃ الی اللہ صفحہ ۹۱۔ مصنفہ صدیق دیندار چن بس ویشیشور)

یہ پمفلٹ ذیل کے پتہ سے ایک آنہ برائے محصول ڈاک بھیجنے سے، بلاقیمت مل سکتا ہے۔

(۱) بیت السلام۔ سیف آباد۔ حیدرآباد (دکن)

(۲) دفتر ماہنامہ "فاران" کراچی

اس میں شبہ نہیں کہ اس قسم کی کوششوں سے (جو محترم برنی صاحب فرما رہے ہیں) چور دروازوں سے گھسنے والوں کی شناخت ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ چور دروازے کبھی بند نہیں ہو سکتے۔ جب تک مسلمان قرآن کی "بنیانِ مرصوص" سے انہیں بند نہیں کرتا۔

اِقبال اور قرآن

از:- پرویز

علامہ اقبال کے قرآنی پیغام سے متعلق محترم پرویز صاحب کے انقلاب آفریں مقالات کا مجموعہ

۲۵۶ صفحات — قیمت:- دو روپے

القرآن الکتاب

(محترمہ زینب خاتون بیگم کاکاخیل۔ وائس پرنسپل اسلامیہ کالج برائے خواتین لاہور)

(طلوع اسلام کی شروع ہی سے دعوت یہ ہے کہ ہماری قوم کی اصلاح ممکن نہیں جب تک قوم کی خواتین کے نظریات و تصورات قرآن کے مطابق تشکل نہیں ہوتے۔ ہمیں یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ اب آہستہ آہستہ ہماری قوم کا یہ اہم حصہ۔ طبقۂ خواتین بھی، طلوع اسلام کی پیش کردہ قرآنی فکر سے قریب آتا جارہا ہے۔ اس کا ثبوت زیر نظر مقالہ ہے جو ایک اعلیٰ درجہ کی تعلیم یافتہ خاتون کے قرآنی تاثرات کا آئینہ دار ہے۔ ہم اس مقالہ کو اسی نقطۂ نگاہ سے ہدیۂ قارئین کر رہے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ قرآنی فکر سے متاثر دیگر خواتین بھی اسی طرح اپنے خیالات کے اظہار کی کوشش کریں گی۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم مدت سے چاہتے ہیں کہ طلوع اسلام میں خواتین کے لئے ایک حصہ مختص کر دیا جائے۔ چہ خوش کہ یہ مقالہ اس تجویز کا قدم اول بن جائے!

طلوع اسلام)

رمضان المبارک کا مہینہ قرآن کریم کی سالگرہ کا مہینہ ہے۔ یعنی وہ مہینہ ہے جس میں قرآن نازل ہوا تھا۔ اسی لئے اس مہینہ میں قرآن کی تلاوت خلاف معمول زیادہ اہتمام سے کی جاتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اپنے مطالب کے لحاظ سے بھی قرآن مومن کے دل پر رمضان المبارک میں ہی بالخصوص نازل ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں فرضیت صوم کا مقصد انسان کے اندر تقویٰ پیدا کرنا ہے اور قرآن کے متعلق سورۂ بقرہ میں ارشاد ہوتا ہے کہ ھدی للمتقین یعنی یہ قرآن ہدایت کا سرچشمہ تو ہے لیکن ان کے لئے جو نفسیاتی طور پر اس سے طلب ہدایت کے خواستگار بھی ہوں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ صوم سے انسان کے اندر تقویٰ پیدا ہوتا ہے اور تقویٰ قرآن سے اخذ ہدایت کے لئے وسیلہ ٹھہرا۔ اس دنیا میں سنت اللہ نے ہر کامیابی اور حصول تمنا کے ساتھ آرزو و جستجو کو وابستہ کر دیا ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ پر غور فرمایئے۔ باوجود اسکے کہ منصب نبوت کے حصول میں آپ کے اکتساب کو دخل نہ تھا بلکہ یہ موہبت الٰہی سے آپ کو ملنے والا تھا۔ لیکن نزول قرآن سے پہلے اپنے نفس کے اندر اس آب کوثر کے جستجو میں غار حرا[1] کے اندر آپ نے کتنی بھوک اور پیاس برداشت کی۔ آرزوئے حق میں کتنی راتیں اور کتنے دن

[1] اگرچہ یہ واقعہ عام طور پر مشہور ہے لیکن (جیسا کہ طلوع اسلام میں اس سے پہلے لکھا جا چکا ہے قرآن اور تاریخ عرب کی روشنی میں صحیح نظر نہیں آتا۔ طلوع اسلام)

آپ نے کرب اور بے چینی میں گزاریں۔ تب کہیں جاکر "اقرأ" کی صدائے جان نواز آپ کو سنائی دی۔ ماہ رمضان میں مومن بھی اپنے ظرف کے مطابق معرفت حق کے لئے وہی بھوک پیاس اور وہی اضطراب آرزو کا تجربہ کرتا ہے تب کہیں جاکر نفسیاتی طور پر وہ اس کے لئے تیار ہوتا ہے کہ قرآن اس پر نازل ہو سکے۔

قرآن کریم نے اپنے لئے القرآن کا نام خود تجویز کیا ہے۔ قرآن فُعْلَان کے وزن پر حاصل مصدر ہے پڑھنے کی (کتاب) گویا نوع انسانی جس کا درجۂ علم ہے اگر اسکے پڑھنے کی کوئی چیز ہے تو یہی قرآن ہے۔ قرآن کریم کا نام الکتاب (THE BOOK) بھی ہے۔ گویا کائنات میں اگر کتاب ہے تو یہی قرآن ہے۔ کائنات کا مرکز انسان ہے اور انسان کے موضوع پر دراصل یہی ایک کتاب ہے جس میں انسان کی ہدایت کے لئے وہ محکم اصول بیان کئے گئے ہیں جن پر انسانی زندگی کی عمارت اٹھائی جانی چاہیئے۔ اور جو اس کے انفرادی و اجتماعی ارتقاء کے ضامن ہیں۔ ان دونوں ناموں کے علاوہ قرآن کریم نے اپنے آپ کو کئی القاب سے ملقب فرمایا ہے۔ یعنی الھدیٰ ۔ النور وغیرہ۔ ان تمام اسماء والقاب سے قرآن کریم کے ان امتیازات پر روشنی پڑتی ہے۔ جو اسے دیگر جملہ کتب مقدسہ پر حاصل ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن کریم محض ایک (Dogmatic Religion) کی کتاب نہیں بلکہ یہ ایک آفاقی کتاب ہے اور ان اٹل اساسی و ابدی قوانین کا مجموعہ ہے جو زندگی کو ارتقاء بخشتے ہیں۔ اس کتاب کو خاص مادرائی تصورات اور پیچیدہ نظریات سے کوئی دلچسپی نہیں۔ یہ کائنات کا ایک ایسا تصور پیش کرتی ہے جس میں انسان مرکزی نقطہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ جو کہ فاعل خود مختار ہے۔ اسی انسان کو یہ کتاب ہدایت کرتی ہے کہ توحید کے تصور پر وہ حیات کی تعمیر کرے۔ چنانچہ سب سے پہلے نازل ہونیوالی چند ایک آیات کے مطالعہ سے ہی اس امر کی تصدیق ہو جاتی ہے ملاحظہ ہو۔

اقرأ باسم ربك الذی خلق۔ خلق الانسان من علق۔ اقرأ وربك
الاکرم الذی علم بالقلم۔ علم الانسان ما لم یعلم۔ الخ

پڑھو اپنے پروردگار کے نام سے جس نے پیدا کیا۔ پیدا کیا انسان کو ایک خون کی پھٹکی سے۔ پڑھو اور
تمہارا پروردگار بڑا کریم ہے جس نے قلم کا استعمال سکھایا۔ سکھایا وہ کچھ انسان کو جو وہ نہیں جانتا تھا۔

مندرجہ بالا آیات کے مطلب پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن نے خدا کی قدرت اور شانِ خلاقی کا ذکر کیا ہے تو انسان جیسے شاہکار کی تخلیق اور اس کے علم و فضل کے حوالے سے۔ گویا خدا کی قدرت کاملہ کا مظہر اگر کوئی ہے تو انسان ہی کی ذات ہے۔ اس سے بڑھ کر انسان کے شرف کے لئے اور کیا دلیل ہو گی۔ معبود کی یکتائی کے تصور کے بعد یہی وہ نوع انسانی کے متعلق اچھوتا تصور ہے جس نے انسان کی کایا پلٹ دی جس نے انسان کو اسکے بے پناہ خفتہ امکانات سے آگاہ کیا اور اسے تعمیر حیات کی دعوت ایک جدید طریقے سے دی۔

انسان کی اجتماعی زندگی کے ارتقاء کی تاریخ بھی آج سے قریباً آٹھ دس ہزار سال پہلے تک کی مرتب ہو چکی ہے۔ تاریخ کا ایک طالبعلم اس تمام عہد تاریخ کو آسانی کے لئے صرف دو حصوں میں تقسیم کر سکتا ہے۔ زمانہ قبل از نزول قرآن اور زمانہ مابعد نزول قرآن۔ قرآن کریم نے خود بھی زمانہ کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے پہلے حصے کا نام "عہد جاہلیت" اور دوسرے کا نام "دور اسلام"

رکھا ہے۔ عہد قبل از نزولِ قرآن اور بعد از نزولِ قرآن میں سب سے بڑا مابہ الامتیاز یہ ہے کہ اول الذکر دور میں نوعِ انسانی ذہنی طور پر اس منزل کو نہ پہنچی تھی کہ توحید کے تصور سے آشنا ہو سکے۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ وہ مقامِ انسانیت سے بھی بے خبر تھی۔ اگر آپ اس دور کی تفصیلات میں نہ پڑیں اور تمام دیگر ملل و اقوام کی کیفیت کو نظر انداز کر کے صرف جناب مسیح علیہ السلام کی بعثت کے وقت اور بعد کے زمانے پر نظر ڈالیں۔ اور نوعِ انسانی کی ذہنی حالت کا اندازہ کریں تو معلوم ہوگا کہ نزولِ قرآن سے چند صدی پیشتر تک بھی وہ کیسی ذہنی جہالت اور عقلی گمراہی میں مبتلا تھی۔ حضور مسیح علیہ السلام کے پیغامِ توحید اور شرفِ انسانیت کو کیسی بے دردی سے دشمن روایات کے غارِ عمیق میں پھینک دیا گیا۔ تب تک انسان ذہنی بلوغ کو نہ پہنچا تھا چنانچہ وہ توحید کے تصور کو قبول ہی نہ کر سکا۔ اور اس نے خدا کے بندے جناب مسیح علیہ السلام کو ہی الوہیت کا درجہ دے دیا۔ اپنے مقام کا سراغ بھی وہ جناب مسیحؑ کی کوششوں سے نہ پا سکا۔ اور اس نے اپنے آپ کو گنہگار ازلی فرض کرتے ہوئے اپنے گناہوں کو ناقابلِ تلافی خیال کیا۔ ایسے ناقابلِ تلافی کہ وہ صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے (نعوذ باللہ) سولی پر چڑھنے سے ہی معاف ہوئے۔ غرضیکہ اناجیل مقدسہ بھی اس وقت کی ترقی یافتہ انسانیت اکثر و بیشتر ہدایت نہ پا سکی اور الٹا اسی کتابِ مقدس کو اس نے شرک و اوہام کا مبدا بنا لیا۔

اب نزولِ قرآن کا وقت آتا ہے۔ قرآن کریم نے خدا کے متعلق ایک ایسا تصور پیش کیا جس نے انسان کے قلب کے لئے مسیحائی کا کام کیا قل ھو اللہ احد کی صدا کچھ ایسے جاں بخش انداز میں بلند ہوئی کہ انسان کا قلبِ سلیم اسے لبیک کہے بغیر نہ رہ سکا۔ دنیا کے تمام چھوٹے بڑے نئے پرانے بت پاش پاش اور سرنگوں ہونے لگے۔ جہاں گلے بیل، شجر و حجر انسان و اوہام کی پرستش ہوتی تھی۔ وہاں سے بھی رفتہ رفتہ صدائے لا الٰہ آنے لگی۔ نوعِ انسانی اپنے اصلی مقام سے پہلی بار روشناس ہوئی۔ اس نے غیر اللہ کی غلامی کا جوا اتار پھینکا۔ نتیجہ آپ ملاحظہ فرمائیے آج وہ تمام ملتیں جو دائرہ اسلام میں رسمی طور پر داخل نہیں ہیں وہ بھی قرآن کے فیضان سے شرف یاب ہیں۔ اور وہ بھی غیر اللہ کی خدائی کو انسان کے لئے سب سے بڑی لعنت سمجھ کر اس سے بیزاری کا بڑے فخر سے اعلان کرتی ہیں۔ شرک و اوہام پاپائیت و شہنشاہیت کا قلع قمع کس کے فیضان سے ہوا؟

قرآن ہی نے سب سے پہلے نبوت کے سلسلے کے ختم ہونے کا اعلان کر کے انسان کو (وحی کی حدود کے اندر رہتے ہوئے) دانش و بصیرت اور عقل و تدبر سے کام لینے کے لئے آزاد چھوڑ دیا۔ قرآن ہی نے انسانی عقل و مشاہدہ و تجربہ سے بار بار اپیل کی ہے۔ قرآن ہی نے مظاہرِ قدرت اور تاریخی شواہد پر غور کرنے کی دعوت دی ہے۔ قرآن ہی نے انسان میں انفس و آفاق میں آیاتِ الٰہی کے مطالعہ کا ذوق پیدا کیا ہے۔ یہ قرآن ہی کی فسوں گستری ہے کہ اسکے نزول کے بعد دیوی دیوتاؤں وغیرہ فوق الفطرت مخلوق کا دور ختم ہو کر انسان کا دور شروع ہوا۔ توہم پرستی کی بجائے حقیقت پژوہی کا دور دورہ ہوا۔ انسان نے ذہنی غلامی سے نجات پا کر انسانی زندگی کے مسائل پر حکیمانہ نظر ڈالنے کا طریقہ سیکھا اور اس طرح (Humanistic Studies) کو ترقی ہوئی۔ مظاہرِ فطرت کی ہیبت سے نجات پانے کے بعد انسان تسخیرِ فطرت کے قابل ہوا۔ اس کے ذوقِ تجربہ و مشاہدہ سے (Experimental Sciences) کو ارتقاء ملا سِيرُوا فِي الْأَرْضِ کی ترغیب نے

انسان کو نئی دنیاؤں کے انکشاف کے قابل بنایا۔ زندگی کو لعنت کی بجائے خیر و برکت سمجھا جانے لگا اور اس کو خوشگوار اور آرام دہ بنانے کی جدوجہد ہر طرف سے شروع ہوئی۔

قرآن ہی نے سب سے پہلے پراثر و پائیدار طریقے پر وحدت انسانی، مساوات انسانی، مساوات جنسی انسانی ہمدردی اور امرِ شورائی کی تعلیم انسان کو دی ہے اور ایسے دل نشیں طور پر تعلیم دی ہے کہ چند ہی صدیوں کے پھیر میں تمام کرہ ارض پر انہی اصول کی محبوبیت کا دور دورہ ہو گیا ہے۔ آج ہر قوم و ہر ملت انہی اصول کے ساتھ محبت و حمایت کا بڑھ چڑھ کر دعویٰ کرتی ہے اور معاشرتی طبقہ بندی، نسل و قوم و رنگ و وطن و جنس کے امتیازات کے تصورات کالعدم ہوتے جا رہے ہیں۔ انسان توحید، شرف انسانیت اور وحدت انسانیت کے تصورات سے واقف ہو گیا ہے وہ Dogmatic Religion کی جکڑبندیوں سے آزاد ہو چکا ہے۔ آزادیٔ فکر اور جوشِ عمل سے ارتقائے زندگی کے منازل کو اس سرعت سے طے کر رہا ہے کہ

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے

یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم کا نام "القرآن" ہے اور یہ ایک کتاب نہیں بلکہ "الکتاب" ہے۔

اِسے ضرور پڑھیئے

قرآنی فکر کو عام کرنے کے لئے یہ طریقہ بھی اختیار کیا گیا ہے کہ محترم پرویز صاحب کے اہم مضامین کو چھوٹے چھوٹے پمفلٹوں کی شکل میں الگ شائع کیا جائے۔ چنانچہ اس وقت حسب ذیل پمفلٹ دفتر میں موجود ہیں اور مل سکتے ہیں۔

بادۂ زندگی	۲ر	علماء کون ہیں؟	۲ر
قوموں کے تمدن پر جنیات کا اثر	۲ر	مقامِ محمدی	۲ر
تقدیرِ امم	۲ر	قانونِ شریعت	۴ر
		جشنِ نزولِ قرآن	۲ر

ناظم ادارہ طلوع اسلام کراچی

چند قابلِ غور حدیثیں

(از: محترم لئیق احمد شاہ صاحب چرتھاولی)

لوگ طلوع اسلام کو منکر حدیث اور نہ جانے کیا کیا کہتے ہیں۔ لیکن کس قدر حیرت ہوتی ہے کہ جب ہم احادیث کے ذخیرہ پر نظر ڈالتے ہیں تو اس میں ہمیں خود ایسی حدیثیں بھی مل جاتی ہیں جو نہ صرف طلوع اسلام کے مسلک کی تائید کرتی ہیں بلکہ یہ ثابت کر دیتی ہیں کہ رسول اکرم صلعم کے عہد ہمایونی میں دین کا جو تصور تھا وہ بعینہٖ وہی تھا جسے آج طلوع اسلام پیش کر رہا ہے۔ میں پچھلے دنوں اتفاق سے علامہ حافظ سیوطیؒ کی ایک کتاب "الجامع الصغیر" کا مطالعہ کر رہا تھا جس میں بہت سی ایسی حدیثیں نظر پڑیں جن میں سے صرف پانچ حدیثوں کو اس وقت ہدیۂ ناظرین کر رہا ہوں۔ ان احادیث کو پیش کرنے سے پہلے اتنا بتا دینا ضروری ہوگا کہ علامہ حافظ جلال الدین سیوطیؒ کا نام نامی علمی دنیا میں محتاج تعارف نہیں۔ یہ بزرگ آٹھویں صدی ہجری کے مستند اور بلند پایہ محدث گذرے ہیں۔ تفسیر میں ان کی کتاب الدر المنثور مستند کتاب مانی جاتی ہے۔ علامہ جلال الدین محلی کی مختصر ترین تفسیر القرآن کو جسے وہ سورۂ اسرا تک لکھ کر انتقال فرما گئے تھے مکمل کرنے کا شرف علامہ حافظ جلال الدین سیوطیؒ ہی کو حاصل ہوا۔ اور یہ کتاب تفسیر جلالین کے نام سے تمام عالم اسلام میں نہ صرف مقبول عام ہے بلکہ تقریباً تمام عربی مدارس کے نصاب میں داخل ہے۔ علامہ سیوطیؒ کا پایہ حدیث میں بھی کافی بلند تھا۔ انھیں حافظ کہا جاتا ہے۔ یعنی ایک لاکھ حدیثیں انھیں ازبر یاد تھیں۔ "الجامع الصغیر" علامہ سیوطیؒ کی وہ اہتمام بالشان کتاب ہے جس میں موصوف نے منتخب احادیث کو جمع کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس انتخاب میں احادیث کی صحت کا پورا پورا لحاظ رکھا گیا ہے۔ یہ کوئی جامع کبیر تو ہے نہیں جس میں ہر قسم کی احادیث جمع کر دی گئی ہوں بلکہ یہ ایک ماہر فن استاد کا ایک چھوٹا سا منتخب مجموعہ ہے جو یقیناً اس قابل ہے کہ اس کو قابل اعتماد تصور کیا جائے۔ جیسا کہ علامہ حافظ جلال الدین سیوطیؒ کی شخصیت متبعین حدیث کے طبقہ میں مسلم ہے۔ اسی طرح ان کی اس کتاب کو بھی قبول عام کا شرف حاصل ہے۔

حدیث کی صحت کی کسوٹی قرآن ہے

طلوع اسلام کا کہنا یہ ہے کہ احادیث کی صحت و سقم کا معیار خدا کی کتاب ہے۔ یعنی اگر کوئی حدیث قرآن کے خلاف جاتی ہے تو اس حدیث کو رسول اکرم صلعم کی طرف منسوب کرنا صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ رسول اللہ صلعم نے تمام عمر خود بھی قرآن کے مطابق عمل فرمایا اور لوگوں کو بھی قرآن کے مطابق ہی عمل کرنے کی ہدایت فرمائی۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ آپ کا کوئی ارشاد یا کوئی عمل قرآن کے خلاف ہو۔

اب یہ دیکھیے کہ اس موضوع پر حدیث کیا کہتی ہے۔ جامع صغیر میں نبی اکرم صلعم کا یہ ارشاد نقل کیا گیا ہے۔

اَعْرِضُوْا حَدِیْثِیْ عَلٰی کِتَابِ اللّٰہِ فَاِنْ وَافَقَہٗ فَھُوَ مِنِّیْ وَاَنَا قُلْتُہٗ (ص ۱۳ ج ۱)

میری طرف جو بات منسوب کی جائے اسے قرآن پر پیش کرکے دیکھ لو۔ اگر وہ بات قرآن کے مطابق ہے تو وہ میری ہی بات ہے اور میں نے اسے کہا ہے (ورنہ نہیں)

حدیث کی صحت کا دوسرا معیار

طلوع اسلام کہتا ہے کہ جو حدیثیں عقل سلیم اور شرف انسانیت کے منافی ہوں ان کی نسبت بھی رسول اللہ صلعم کی طرف کرنا غلط ہے۔ اس لئے کہ رسول اللہ صلعم شرف انسانیت کے اس بلند مقام پر فائز تھے جس تک آج تک کوئی انسان پہنچ سکا ہے نہ آئندہ پہنچ سکتا ہے۔ لہٰذا یہ ہو نہیں سکتا کہ حضور اکرم صلعم نے کوئی ایسی بات فرمائی ہو یا کوئی ایسا کام کیا ہو جو عقل سلیم یا شرف انسانیت کے منافی ہو۔ اب دیکھیے کہ رسول اللہ صلعم اس موضوع پر کیا فرماتے ہیں۔ جامع صغیر میں ہے۔

اِذَا سَمِعْتُمُ الْحَدِیْثَ عَنِّیْ تَعْرِفُہٗ قُلُوْبُکُمْ تَلِیْنُ لَہٗ اَشْعَارُکُمْ وَاَبْشَارُکُمْ
تَرَوْنَ اَنَّہٗ مِنْکُمْ قَرِیْبٌ فَاَنَا اَوْلَاکُمْ بِہٖ، وَاِذَا سَمِعْتُمْ عَنِّیْ حَدِیْثًا
تُنْکِرُہٗ قُلُوْبُکُمْ وَتَنْفِرُ مِنْہُ اَشْعَارُکُمْ وَاَبْشَارُکُمْ وَتَرَوْنَ اَنَّہٗ بَعِیْدٌ
مِنْکُمْ فَاَنَا اَبْعَدُکُمْ مِنْہُ (ص ۲ ج ۱)

جب تم میری کوئی حدیث سنو اور اسے تمہارے دل (عقل) مان لیں۔ اور تمہارے بال اور چمڑے اس کے لئے نرم پڑ جائیں۔ اور تم خیال کرو کہ یہ بات تم سے زیادہ قریب ہے تو میں ایسی بات کہنے کا تم سے زیادہ حقدار ہوں۔ لیکن جب تم میری کوئی ایسی حدیث سنو جسے تمہارے دل (عقلیں) نہ مانیں اور تمہارے بال اور چمڑے اس سے نفرت کریں۔ اور تم خیال کرو کہ ایسی بات تم سے بعید ہے تو میں تمہاری بہ نسبت اس سے کہیں زیادہ بعید ہوں۔

تحلیل و تحریم کا حق صرف خدا کو ہے

طلوع اسلام کہتا ہے کہ چیزوں کو حلال یا حرام قرار دینے کا حق صرف خدا کو حاصل ہے جس چیز کو خدا نے حلال ٹھہرایا ہو اسے کسی کو حرام قرار دینے کا حق نہیں ہے۔ لہٰذا وہی چیزیں حرام ہیں جنہیں کتاب اللہ نے حرام قرار دیا ہے۔ اور جن چیزوں کو قرآن کریم نے حرام قرار نہیں دیا انہیں کوئی حرام نہیں قرار دے سکتا۔ اب دیکھیے کہ اس ضمن میں رسول اللہ صلعم کی ہدایت کیا ہے۔ جامع صغیر میں ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا۔

اَلْحَلَالُ مَا اَحَلَّ اللّٰہُ فِیْ کِتَابِہٖ وَالْحَرَامُ مَا حَرَّمَ اللّٰہُ فِیْ کِتَابِہٖ وَمَا سَکَتَ عَنْہُ
فَھُوَ مِمَّا عُفِیَ عَنْہُ (ص ۳۲ ج ۱)

حلال وہ ہے جسے اللہ نے اپنی کتاب میں حلال قرار دیدیا اور حرام وہ ہے جسے اللہ نے اپنی کتاب میں حرام قرار دیا اور جن چیزوں کے بارے میں خاموشی اختیار کی گئی ہے وہ ان چیزوں میں سے ہیں جن سے درگذر کیا گیا ہے۔

غیر قرآنی جزئیات ناقابل ترمیم نہیں

طلوع اسلام کہتا ہے کہ دین کے اصول قیامت تک کے لئے ہیں یعنی جو چیزیں اصولی طور پر قرآن نے متعین کر دی ہیں۔ ان میں قطعاً کوئی تبدیلی نہیں کی جا سکتی لیکن ایسی جزئیات جنھیں قرآن نے متعین نہیں کیا بلکہ انھیں مسلمانوں کے اجتماعی نظام کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا ہے تو ملت کا قرآنی نظام ایسی جزئیات کو باہمی مشورے سے متعین کرے گا۔ چنانچہ مسلمانوں کے اس نظام نے جسے رسول اللہ صلعم والذین معہ نے سب سے پہلے قائم کیا تھا۔ ایسی جزئیات کو اپنے احوال وظروف کے مطابق متعین فرمالیا تھا۔ مگر یہ تمام جزئیات قیامت تک کے لئے حرف آخر نہیں ہیں۔ اگر بعد کے حالات کا تقاضا ہو تو علیٰ منہاج النبوت قائم ہونے والا نظام اپنے عہد کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر ان میں تغیر و تبدل کر سکتا ہے۔ اب دیکھئے کہ اس ضمن میں رسول اللہ صلعم کا ارشاد کیا ہے۔ جامع صغیر میں ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا

اَطِیْعُوْنِیْ مَا کُنْتُ بَیْنَ اَظْهُرِکُمْ وَ عَلَیْکُمْ بِکِتَابِ اللّٰهِ اَحِلُّوْا حَلَالَهٗ وَحَرِّمُوْا حَرَامَهٗ (صـــ)

جب تک میں تمہارے درمیان میں موجود ہوں میری اطاعت کرو اور اپنے اوپر اللہ کی کتاب کی پابندی فرض قرار دے لو۔ وہ جس چیز کو حلال قرار دے اسے حلال کرو۔ اور جسے وہ حرام قرار دے اسے حرام قرار دو۔

اس حدیث سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ رسول اللہ صلعم کی جو اطاعت بحیثیت امیر ملت ہونے کے مسلمانوں پر فرض تھی۔ وہ آپ کی وفات کے بعد آپ کے جانشین کی اطاعت میں منتقل ہو جاتی ہے۔ اور اس طرح ہر زمانہ میں وقت کے زندہ امیر ملت کی طرف منتقل ہوتی رہتی ہے۔ جو ان کے قرآنی نظام (علیٰ منہاج النبوۃ) کا رئیس ہو۔

مذکورہ بالا حدیثیں چونکہ قرآنی تعلیمات کے عین مطابق ہیں اس لئے ہم ان حدیثوں کو تسلیم کرتے ہیں۔ کیا وہ حضرات بھی جلتے بیٹھتے اتباعِ حدیث کا دم بھرا کرتے ہیں۔ ان احادیث پر غور فرما کر ان کی ہدایات پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کرینگے یا وہ علامہ سیوطی کو بھی منکرِ حدیث قرار دے دیں گے!

والسلام لئیق احمد شاہ چرتھاولی

خوشاب۔ ضلع سرگودھا۔

۲۰ نومبر ۱۹۵۶ء

قرآنی انقلاب کا صحیح تصور

ان کتابوں سے پیدا ہو سکے گا

معراجِ انسانیت حضور صلعم کی ذات اقدس و اعظم شرفِ مجد انسانیت کے کس مقام بلند پر فائز تھی اسے قرآنی آئینہ میں دیکھنے کی پہلی اور کامیاب کوشش۔ مذاہب عالم کی تاریخ اور تہذیبی پس منظر کے ساتھ ساتھ سیرت مقدسہ کے متنوع گوشے نکھر کر سامنے آ گئے ہیں۔ بڑے سائز کے نو سو صفحات۔ اعلیٰ ولایتی گلیزڈ کاغذ۔ مضبوط و حسین جلد۔ قیمت بیس روپے۔

ابلیس و آدم سب سے پہلا انسان کس طرح پیدا ہوا تھا؟ جنات۔ ملائکہ۔ وحی۔ شیطان اور ابلیس جیسے اہم مباحث کیلئے سلسلہ معارف القرآن کی اس پہلی کڑی کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔ بڑی تقطیع کے ۲۷۶ صفحات قیمت آٹھ روپے

جوئے نور کاروانِ نبوت کے درخشندہ ستاروں یعنی حضرات انبیائے کرام از حضرت نوحؑ تا حضرت شعیبؑ کے تذکار جلیلہ پر تفصیلی کتاب سلسلہ معارف القرآن کی دوسری کڑی۔ سائز ۲۹×۲۲ ۳۶۸ صفحات۔ قیمت مجلد چھ روپے

انسان نے کیا سوچا؟ زندگی کے اہم مسائل کے حل کے لئے انسانی فکر نے کیا کیا کوششیں کیں اور اس کا نتیجہ کیا نکلا! بیش بہا معلومات کا ذخیرہ سائز ۲۹×۲۲ ۳۶۸ صفحات قیمت دس روپے

سلیم کے نام خطوط مذہب کے متعلق نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کے دل میں جو شکوک و شبہات اور اعتراضات پیدا ہوتے ہیں ان کا نہایت شگفتہ اور شاداب جواب بڑے سائز کے ۴۰۸ صفحات قیمت چھ روپے

فردوسِ گم گشتہ ان مضامین کا مجموعہ جنہوں نے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی نگاہوں کا زاویہ بدل دیا ہے اور فکر و نظر کی نئی راہیں کھول دی ہیں۔ اردو لٹریچر کی بلند پایہ کتاب ۴۱۶ صفحات قیمت چھ روپے

نظامِ ربوبیت نوعِ انسانی کا سب سے اہم اور مشکل سوال اس کا معاشی مسئلہ ہے اس مسئلہ کا حل عقل انسانی نے کیا سوچا اور قرآن اس کا کیا حل بتاتا ہے دورِ حاضر کی عظیم کتاب۔ بڑا سائز ضخامت ۴۰۰ صفحات۔ قسم اول مجلد چھ روپے۔ قسم دوم غیر مجلد چار روپے۔

اسبابِ زوالِ امت (دوسرا ایڈیشن) مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ میں پہلی مرتبہ بتایا گیا ہے کہ ہماری نکبت و زوال کے اسباب کیا ہیں اور ان کا علاج کیا؟ ضخامت ۱۷۲ صفحات۔ قیمت دو روپے۔

(یہ تمام کتابیں محترم پرویز کے تدبر فی القرآن کا نتیجہ ہیں)

ملنے کا پتہ:۔ ناظم ادارہ طلوع اسلام ۱۵۹/۳ ایل (پی۔ ای۔ سی۔ ہاؤسنگ سوسائٹی) کراچی نمبر ۲۹

بقیہ لمعات صفحہ ۸

ہمیں اس چیز کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ زمانے کے تقاضوں کا ساتھ دینے کے لئے جس حد تک جانے کی ضرورت ہو چلے جائیں لیکن اس میں اسلام کے وہ مستقل اصول ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائیں جس کی بنیادوں پر اسکی عمارت استوار ہے

ہمارے نزدیک جو نوجوان اس اصولِ زندگی کا تصور اپنے سامنے رکھتا ہے۔ وہ اقبال کا خلف الرشید بننے کا حقدار ہے۔ ہماری آرزو ہے کہ عزیز محترم ڈاکٹر جاوید اپنی تصورات کو لے کر پروان چڑھیں اور حضرت علامہ نے جو توقعات ان سے (اور اُن کی وساطت سے نژادِ نو سے) وابستہ کی تھیں وہ ایک ایک کر کے پوری ہوتی جائیں۔ ہماری اس آرزو پر حضرت علامہ کا وہ پرسوز قلب شاہد ہے جس سے جاوید کے لئے یہ دعا نکلی تھی کہ

سرِ دینِ مصطفےٰ گویم ترا
ہم بقبر اندر دعا گویم ترا

(جاوید نامہ کا خاتمہ اس شعر پر ہوتا ہے)

(۳)

پرچہ پریس میں جا رہا تھا کہ اخبارات میں دو ایسی خبریں دیکھیں جن سے دل دھڑکنے لگ گیا۔ پہلی خبر یہ ہے کہ حکومت کی اس تجویز کے خلاف کہ مغربی پاکستان میں بھی مخلوط انتخاب ہو، مسلم لیگ سول نافرمانی کی تحریک چلانے کا ارادہ رکھتی ہے مخلوط انتخاب کے متعلق طلوع اسلام کے خیالات کسی سے پوشیدہ نہیں۔ یہ ۱۹۳۸ء سے مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کا پیامبر ہے۔ اور مسلم اور غیر مسلم کو ملا کر ایک قوم کے تصور کو اسلام کے اصل الاصول کے خلاف سمجھتا ہے۔ لیکن مسلم لیگ کا اس قسم کا فیصلہ تعجب انگیز ہے۔ سب سے پہلے تو اس لئے کہ (جیسا کہ ہم نومبر ۱۹۵۶ء کے طلوع اسلام میں شرح وبسط سے لکھ چکے ہیں) پاکستان کے آئین میں یہ شق موجود ہے کہ مسلم اور غیر مسلم دونوں پاکستان کی مجلسِ قانون ساز کے ممبر ہو سکتے ہیں۔ اور قانون سازی کے کام میں دونوں ایک ہی حیثیت سے شرکت کر سکتے ہیں۔ نیز صدر مملکت کا انتخاب بھی ان سب کی مشترکہ آراء سے ہوگا۔ یہ وہ اصل ہے جس کی شاخ مخلوط انتخاب ہے یعنی جب ایوان کے اندر پہنچ کر مسلمانوں اور غیر مسلموں نے ایک ہی قوم بن جانا ہے اور کسی تفریق وتمیز کے بغیر تمام امور کو مخلوط طور پر سرانجام دینا ہے، تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ وہ ایوان میں ایک دروازے سے داخل ہوں گے یا دو الگ الگ دروازوں سے۔ ہم نے اس زمانے میں پکار پکار کر کہا تھا کہ مجلسِ قانون ساز میں غیر مسلموں کی یہ پوزیشن بحیرا اسلام کے خلاف ہے۔ لیکن اسے کسی نے قابلِ توجہ نہ سمجھا اور آئین پاس ہو گیا۔ یہ آئین، اس زمانے میں پاس ہوا تھا جب خود مسلم لیگ کی حکومت تھی۔ اور ملک کی مذہبی جماعتوں نے اس کے پاس ہونے پر شادیانے بجائے تھے۔ لہٰذا جب مسلم لیگ اور ملک کی دوسری جماعتیں اتنی بڑی غیر اسلامی اصل کو تسلیم کر چکی ہیں تو وہ کس منہ سے مخلوط انتخاب کی مخالفت کرتی ہیں؟ دوسرے یہ کہ اس سے پیشتر مجلس قانون ساز

مشرقی پاکستان کے لئے مخلوط انتخاب کا قانون پاس کر چکی ہے۔ اگر مخلوط انتخاب کے خلاف اس قسم کے اقدامات ضروری تھے۔ تو مسلم لیگ اُس وقت کیوں خاموش رہی؟ تیسرے (اور یہ سب سے اہم بات ہے کہ) اگر ہم نے قوم کو قانون شکنی کا سبق سکھا دیا تو پھر پاکستان کی گلیوں میں اسی طرح خون بہے گا جس طرح انڈونیشیا میں بہہ رہا ہے۔ ہم مسلم لیگ کے ارباب حل وعقد سے پورے زور سے درخواست کریں گے کہ وہ خدا کے لئے اس مظلوم اور کمزور قوم کی حالت پر رحم کھائیں اور اسے اس طرح تباہ نہ ہونے دیں۔ مخلوط انتخاب بے شک پاکستان کے تصور کے منافی ہے۔ لیکن ایک آئینی ملک میں اس قسم کے فیصلہ کو آئینی طور پر بدلوانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ نہ کہ قانون شکنی جیسے تباہ کن حربوں سے۔ آئینی طریق یہ ہے کہ آپ آئندہ الیکشن میں ایسے لوگوں کو منتخب کرائیے جو تصور پاکستان کے محافظ ثابت ہوں۔ اگر آج کی اسمبلی اس کے خلاف فیصلہ کر دیتی ہے تو دوسری اسمبلی اس فیصلہ کو کالعدم قرار دے سکتی ہے۔

اس کے ساتھ ہی ہم قوم سے بھی درخواست کریں گے کہ وہ اپنے بھلے اور بُرے میں خود تمیز کرے۔ اور ان لیڈروں کی اشتعال انگیز باتوں میں نہ آئے۔ یہ کشمکش درحقیقت حکومت کی کرسیوں پر متمکنین اور محرومین کے ٹولے کی باہمی رسہ کشی ہے۔ جس میں بھولے بھالے عوام کو قربانی کا بکرا بنایا جا رہا ہے۔ ہمارے ہاں دس برس سے یہی ہو رہا ہے کہ جن سے کرسیاں چھن جاتی ہیں ان کے نزدیک اسلام خطرے میں آ جاتا ہے اور جب انھیں پھر کرسیاں مل جاتی ہیں تو اسلام ہر قسم کی آفت سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کشمکش میں عوام بچاروں کا کچومر نکل جاتا ہے۔

دوسری خبر یہ ہے کہ مشرقی پاکستان کے وزیراعظم اور راجہ غضنفر علی خاں صاحب (سابق ہائی کمشنر ہندوستان تشریف لے گئے ہیں۔ یہ عین اُس دن ہوا ہے جب مسٹر یارنگ، کشمیر کے متعلق، صیانتی کونسل میں اپنی رپورٹ پیش کرنے والے ہیں۔ خدا کرے کہ ان حضرات کا یہ سفر خیر و عافیت کا سفر ہو۔ ورنہ ہمارا تو اس سے ماتھا ضرور ٹھنکا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ بغداد کو ہلاکو خاں نے تباہ نہیں کیا تھا۔ اس کی بربادی خود بغداد کے سب سے اونچے ارباب حل وعقد کے ہاتھوں وجود میں آئی تھی۔

نوادرات

علامہ اسلم جیراجپوری کے مضامین کا نادر مجموعہ۔ بڑا سائز۔۔ ۴۰ صفحات

قیمت:۔ چار روپے

رابطۂ باہمی

جملہ بزمہائے طلوع اسلام کی خدمت میں

۱۔ درخواست کی جاتی ہے کہ دستور کی کاپیاں آپ کو بھیجی جاچکی ہیں۔ براہ کرم اپنی رائے سے مرکزی بزم کو آگاہ کریں۔ (۲) ربوٹی کا مسئلہ سندھی زبان میں اور (Polygamy in Islam) تعددازدواج انگریزی میں آپ کو بھیجا جارہا ہے۔ اس کی تقسیم کا معقول اور خاطر خواہ انتظام کیجیے۔ (۳) قرآنی فکر کی عام اشاعت کے سلسلے میں ادارہ کی طرف سے شائع کردہ پمفلٹ ادارہ سے منگواکر زیادہ سے زیادہ تقسیم کیجیے۔

مرکزی بزم طلوعِ اسلام کراچی

نے ربوٹی کا مسئلہ سندھی زبان میں اور (Polygamy in Islam) انگریزی میں ایک مضمون گجراتی میں بعنوان (In Rome do as Romans do is it true) اور بزم خواتین کراچی کی طرف سے "آدم وحوا" اور سندھی زبان میں ایک اشتہار بعنوان "مرکزی بزم طلوع اسلام کراچی کا مقصد اور مسلک" شائع کراکر منظم طریقے سے تقسیم کرایا ہے۔ (۲) مرکزی بزم کے زیر اہتمام عربی کلاس جاری ہے جس میں احباب کافی ذوق وشوق کے ساتھ عربی کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔

بزم طلوع اسلام قادر آباد۔ ضلع گجرات

کے ترجمان سراج الدین صاحب اطلاع دیتے ہیں کہ انھوں نے سراج الدین صاحب کی دکان پر کچھ کتابیں عوام کے مطالعہ کے لئے رکھی ہیں۔ جن سے کافی لوگ مستفید ہو رہے ہیں۔

(۲) قرآنی مطبوعات منظم طریقے سے عوام میں تقسیم کی جارہی ہیں اور لوگوں میں قرآنی شوق دن بدن بڑھتا جارہا ہے۔

بزم طلوع اسلام پشاور

کے ترجمان اطلاع دیتے ہیں کہ ان کے اراکین جوش وخروش سے کام کر رہے ہیں اور تقاضہ کر رہے ہیں کہ "مفہوم القرآن" اور "لغت قرآن" چھپوانے کی جلد از جلد کوشش کی جائے۔

بزمِ طلوع اسلام دیونا منڈی۔ ضلع گجرات

کے ترجمان اطلاع دیتے ہیں کہ ان کے اراکین قرآنی مطبوعات عوام میں مفت تقسیم کر رہے ہیں اور بطیب خاطر ماہوار رقم جمع کرتے ہیں۔ جس سے قرآنی فکر کی نشر واشاعت کی جاتی ہے۔

بزم طلوع اسلام دھریکان کلاں۔ تحصیل پھالیہ۔ ضلع گجرات

کے ترجمان اطلاع دیتے ہیں کہ قرآنی فکر یہاں عام ہو رہی ہے۔ یہاں نئی بزم قائم کی گئی ہے۔ قرآنی فکر سے دلچسپی رکھنے والے حضرات محمد نذیر صاحب تارڑ۔ مالک تارڑ

جنرل اسٹور سے رابطہ قائم کریں۔ ایک دارالمطالعہ قائم کیا گیا ہے۔ جس میں تمام احباب قرآنی لٹریچر کا مطالعہ کرتے ہیں۔

بزم طلوع اسلام ایبٹ آباد

کے ترجمان اطلاع دیتے ہیں کہ طلوع اسلام کنونشن لاہور کے فیصلوں کی روشنی میں بزم کام کر رہی ہے۔

(۲) ڈاکٹر سمیع الدین صاحب کی جگہ محمد حنیف صاحب کو ترجمان بنایا گیا ہے۔

بزم طلوع اسلام سیالکوٹ

کے ترجمان اطلاع دیتے ہیں کہ صلاح الدین صاحب کو بزم ہذا کا قائمقام ترجمان مقرر کیا گیا ہے

(۲) مقامی ضروریات کے لئے ماہوار رقم کی فراہمی کا انتظام کیا گیا ہے۔

تاکید

بزم ہائے طلوع اسلام دیوناجلیانی، مظفر گڈھ، راولاکوٹ، ملتان۔ گوجرانوالہ۔ لاہور۔ جام پور۔ لائل پور ڈیرہ اسمٰعیل خاں۔ کوہاٹ۔ مردان۔ گجرات۔ ہزارہ۔ سکھر اور لاڑکانہ سے درخواست کی جاتی ہے کہ آپ اپنی ماہوار رپورٹ باقاعدگی سے ہر ماہ کی دس تاریخ تک مرکزی دفتر کو بھیجا کریں۔ نیز ٹھٹھہ۔ نواب شاہ۔ حیدرآباد سندھ اور گھمبٹ سندھ کے قرآنی احباب سے درخواست کی جاتی ہے کہ آپ اپنے یہاں بزم طلوع اسلام کی بنیاد ڈالیں۔ اور مرکزی دفتر سے رابطہ قائم کریں۔ جو مشورہ یا مدد آپ کو درکار ہو بلا تامل مرکزی بزم سے طلب کریں۔

تمام بزم ہائے طلوع اسلام سے درخواست کی جاتی ہے کہ اپنے اراکین کی فہرست معہ پتہ اور دیگر تفاصیل مرکزی بزم کو بہت جلد بھیج دیں۔

سکریٹری مرکزی بزم طلوعِ اسلام
۱۲۵۔ خلیق منزل۔ گارڈن ویسٹ۔ کراچی نمبر ۳۔

اسلامی معاشرت

مسلمانوں کے اخلاق و عادات کا خاکہ۔ رہنے سہنے کے ڈھنگ۔ سرکاری ملازمین کے فرائض و واجبات۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی کا ہر اسلوب قرآنی آئینہ میں۔

قیمت۔ دو روپے۔

چند بصیرت افروز کتابیں

جشن نامے ہم پھر جشن جمہوریہ منانے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ مگر کیا یہ جشن بھی اسی طرح منایا جائے گا جیسے ہم نو سال سے جشن مناتے چلے آئے ہیں۔ ہمارے جشنوں کی تبسم فشاں اور درد انگیز تصویر۔ ۲۵۶ صفحات قیمت دو روپے

مزاج شناسِ رسولؐ پیشوایانہ ڈکٹیٹریت کی راہیں کس طرح ہموار کی جا رہی ہیں اسے سمجھنے کے لئے اس کتاب کو پڑھیے تاکہ جماعت اسلامی کا صحیح موقف آپ کے سامنے آجائے۔ قیمت چار روپے

مقامِ حدیث (ہر دو جلد مکمل) حدیث سے متعلق تمام اہم سوالات کے تفصیلی جواب۔ حدیث کی تاریخ۔ منکرِ حدیث کون ہیں۔ غرضیکہ احادیث کے متعلق اتنی وسیع معلومات آپ کو کہیں نہیں ملیں گی۔ ہر جلد تقریباً چار سو صفحات۔ قیمت فی جلد چار روپے۔ مکمل آٹھ روپے۔

قرآنی فیصلے روزمرہ زندگی کے ساتھ اہم مسائل و معاملات میں قرآن ہمیں کیا راہ نمائی دیتا ہے اور ہم کیا کر رہے ہیں دین کے متعلق پر از معلومات اور حقیقت کشا کتاب ہے ۴۰۸ صفحات قیمت چار روپے

قرآنی دستور پاکستان اس میں پاکستان کے لئے قرآنی دستور کا خاکہ دیا گیا ہے اور حکومت علماء اور اسلامی جماعت کے مجوزہ دستوروں پر تنقید کی گئی ہے ۲۲۴ صفحات۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے

اسلامی نظام اسلامی مملکت کے بنیادی اصول کیا ہیں؟ اور اسلامی نظام کیسے قائم ہو سکتا ہے۔ اسکے جواب میں جناب پرویز اور علامہ اسلم جیراجپوریؒ کے مقالات کا مجموعہ۔ جنھوں نے فکر و نظر کی نئی راہیں کھول دی ہیں۔ ۱۸۰ صفحات۔ قیمت دو روپے

اقبال اور قرآن از: پرویز علامہ اقبال کے قرآنی پیغام سے متعلق محترم پرویز صاحب کے انقلاب آفریں مقالات کا مجموعہ ۲۵۶ صفحات۔ قیمت دو روپے

اسلامی معاشرت از: پرویز مسلمانوں کی روزمرہ کی زندگی کے لئے قرآن کے ارشادات۔ بالخصوص بچوں، عورتوں اور کم پڑھے لکھے لوگوں کے لئے۔ اسلام کی بنیادی تعلیم کے لئے اس سے بہتر کتاب آپ کو نہیں ملیگی۔ ۱۹۲ صفحات قیمت دو روپے

(محصول ڈاک ہر حالت میں بذمہ خریدار ہوگا)

ملنے کا پتہ۔ ناظم ادارہ طلوع اسلام ۱۵۹/۲۔ ایل (پی۔ ای۔ سی ہاؤسنگ سوسائٹی) کراچی نمبر ۲۹

چھوٹا مسواک ٹوتھ برش

دانتوں کی صفائی بچوں کو صحت مند اور توانا رکھتی ہے

چھوٹے بچوں کے لئے چھوٹا مسواک

نایاب تحفہ ہے

جو نرم و نازک مسوڑوں کے لئے بے ضرر ہے اور

جس کا استعمال بچوں کیلئے مفید ترین مشغلہ ہے